شہرِ ادب
پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
ماہنامہ 'امکان' لکھنؤ

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

ماہنامہ 'امکان' لکھنؤ

SHAHR-E-ADAB
By
Dr. Malikzada Manzoor Ahmad
Edition: 2011, Rs. 160/-

نام کتاب	:	شہرِ ادب
مصنف	:	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
سال اشاعت	:	۲۰۱۱ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	محمد اکرام
طباعت	:	کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔
ناشر	:	ماہنامہ 'امکان' سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ، کلیان پور، لکھنؤ

ملنے کے پتے

- ماہنامہ 'امکان' سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ، کلیان پور، لکھنؤ
- مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
- دانش محل، امین آباد، لکھنؤ
- اقصیٰ پبلک لائبریری، چودھری محلّہ، کارکوری، لکھنؤ

فہرست

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ''شہرِ ادب'' میں شامل مضامین مختلف رسائل اور جرائد میں مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ تحقیقی، کچھ تنقیدی اور کچھ تاثراتی رنگ و آہنگ کے ہیں۔ یوں تو میں نے گذشتہ پچاس برسوں میں نہ جانے کتنے مضامین اور کتابوں کے پیش لفظ تحریر کیے مگر ان میں سے چند احباب کی فرمائش پر زیرِ نظر کتاب میں اکٹھا کر دیئے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کا تعین خود قارئین اپنے معیارِ نقد و نظر پر کرلیں گے۔ البتہ میں یہاں پر صرف یہ ذکر کروں گا کہ عزیز گرامی قدر ڈاکٹر مخمور کاکوروی اگر بار بار مجھے اُکساتے نہ رہتے تو یہ اکٹھا نہ کیے جاتے اور کتابی صورت میں آپ کے سامنے نہ آتے۔

ڈاکٹر مخمور کاکوروی لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے طالب علم اور اتر پردیش اردو اکادمی میں میرے رفیقِ کار رہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر اور ادب دوست انسان ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے طباعت اور کتابت کے مختلف مراحل میں میرے ساتھ تعاون فرمایا ہے اور انھیں کے زیرِ نگرانی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کتاب میں شامل مضامین آپ کو پسند آئیں گے۔

ملک زادہ منظور احمد

لکھنؤ

۱۶/اپریل ۲۰۰۹ء

اردو کا ادارۂ رابطۂ عامہ

مشاعرہ

مسرت ہے کہ ''عصری ادب'' کے توسط سے مشاعرہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ سنجیدہ حلقوں میں موضوع گفتگو بن رہا ہے۔ عام طور پر ''ہمارے شرفائے ادب'' نے گزشتہ ۳۰ - ۳۵ برسوں میں مشاعروں کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ کیا ہے اور ان شعرا کو قدرے تضحیک آمیز زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا ہے جنھوں نے مشاعرے کی شرکت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ''شرفائے ادب'' کے اس رویئے میں دیگر نفسیاتی اسباب و علل کے ساتھ ساتھ ان کا وہ احساس کمتری بھی شامل ہے جو ان کو اپنے تمام تر دقیق اکتسابات کے باوجود عوامی شہرت کی ان بلندیوں پر نہیں پہنچا سکا جن پر ادبی نقطۂ نظر سے مشاعروں کا وہ کم عیار متشاعر بھی فائز ہو گیا ہے جس کی رسائی شہرِ ادب کی فصیلوں تک بھی نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے صفِ اوّل کے ناقدین اور محققین جو اپنے اپنے دائرہ تصنیف میں حیاتِ جاودانی حاصل کر چکے ہیں، اپنی آخری عمروں میں اپنے مجموعہ ہائے کلام کے ساتھ یکایک منظر عام پر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ حضرات نہ تو خواص کے حلقہ میں اپنی محدود دائمی شہرت پر قناعت کر پاتے ہیں اور نہ اپنی وضع داری کے باعث ان حربوں کا استعمال کر کے عوامی شہرت حاصل کر پاتے ہیں جن کا مطالبہ دور حاضر کا مشاعرہ اپنے شاعروں سے کرتا ہے اور پھر یہ خلش مختلف تاویلات سے گزرتی ہوئی اپنے اظہار کا عجیب و غریب پیرایہ تلاش کر لیتی ہے۔

''مشاعرہ ایک کاروبار بن گیا ہے، فلاں شخص گویا ہے، میں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا ہے، وغیرہ وغیرہ'' تلخ کتنی ہی کیوں نہ ہو، سچی بات تو یہ ہے کہ مشاعروں کے سلسلے میں ان جیسے حضرات کا رویہ ہمیشہ منفی ہوتا ہے اور وہ مثبت طور پر نہ تو ایک محدود حلقہ میں اپنی دائمی شہرت پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ عوام نے انھیں رد کردیا ہے۔ بہرحال تمہیدی کلمات کے بعد اب میں براہِ راست آپ کے سوالات پر آتا ہوں:-

سوال: پچھلے ۳۵ برس میں مشاعرہ کا زبان کی ترویج اور ادبی ذوق کی تشکیل میں کیا حصہ رہا ہے؟

جواب: کسی بھی فرد یا ادارہ کی قدر و قیمت کا تعین اس عہد کے بنیادی مطالبات کے پس منظر میں ہونا چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو اصلاحی تحریکات سرگرم عمل رہیں، وہ اپنے عہد کے سیاق و سباق میں ترقی پسندانہ نظریات پر مبنی تھیں لیکن انھیں افکار و نظریات کی تبلیغ اگر ۱۹۴۷ء کے بعد کی جاتی تو شاید عصر حاضر اسے رجعت پسندی سے تعبیر کرتا۔ آزادیٔ وطن کے بعد جب ہم ماہ و سال کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو ہمارے ملک میں اُردو زبان کا مسئلہ قدم قدم پر الجھتا ہوا نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رجعت پرست عناصر نے منظم طور پر عوام سے اُردو زبان کے رشتہ کو کاٹنے کے لیے ایک سازش کرلی ہو۔ تقسیم ملک کے سانحے نے اچھے ادب کی تخلیق کے لیے بہت سے عنوانات فراہم کردیے تھے مگر وہ نسل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی تھی جو اس اعلیٰ درجہ کے ادب سے استفادہ کرسکتی تھی۔

اگر کسی زبان میں ۳۰-۳۵ سال تک اچھے ادب کی تخلیق نہ ہو تو یہ کوئی بہت بڑا المیہ نہیں ہوتا۔ سانحہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا ادب تو تخلیق ہوتا رہے مگر اس کے پڑھنے والے ختم ہوجائیں۔ ہمارے عہد کا اولین تقاضہ یہ تھا کہ ہم بادِ مخالف کی زد پر اردو زبان کے چراغ کو روشن رکھتے تاکہ اس کی روشنی میں ادب کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کی شناخت ہوسکتی۔ آزادی کے بعد مشاعروں کی قدر و قیمت کا تعین ہمارے عہد کے اسی بنیادی

تقاضے کے پس منظر میں ہونا چاہئے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مشاعرہ صرف لسانی توسیع کا عمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ادبی اور تہذیبی روایت کے تسلسل کا بھی نام ہے۔ اس لیے اس کی ادبی اور تہذیبی سطح کی پرکھ کا کام بھی ہمارے اوپر واجب ہے۔

ادبی اور تہذیبی سطح کو تو میں بعد میں موضوع گفتگو بناؤں گا۔ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آزادی کے بعد اردو زبان کی ترویج واشاعت میں مشاعروں کا کیا کردار رہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس دور میں مشاعروں کی تعداد میں اسی تناسب کے ساتھ اضافہ ہوا ہے جس تناسب کے ساتھ دنیا کی آبادی بڑھی ہے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ آج کوئی دارالعلوم، کالج، اسکول، فیکٹری، میلہ، نمائش، شہر، قصبہ یا سرکاری اور نیم سرکاری ادارہ ایسا نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی پیمانے پر مشاعروں کا انعقاد ایک تہذیبی فریضہ نہ بن گیا ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اسے دیوان خانوں اور محل سراؤں کے محدود سامعین سے نکال کر لامحدود جمہور کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ بجلی، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اور ٹیپ رکارڈر کی ایجادات نے اس کے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع تر بنا دیا ہے اور اس دائرہ عمل کی زد میں آنے والے اب وہ چند مخصوص افراد ہی نہیں ہوتے جنھوں نے ادب اور جمالیات کی قدریں متعین کی ہیں، بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت، علم و جہل، تہذیبی و ادبی سطح، ہزاروں بلکہ لاکھوں کے اجتماع پر اس کا جادو چلتا ہے۔ اب مشاعروں کا اہتمام یوں نہیں ہوتا:

> ''گرمیوں کے دن تھے، مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا۔ شام تک زمین سرد رہے۔ اس پر دری بچھا کے اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کر منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہانڈیوں میں سفید پان کے ساتھ ساتھ گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں

بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی اس لیے روشنی کا انتظام نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب، میر صاحب آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا۔ پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا" (امراؤ جان ادا)

اب مشاعروں کا اہتمام گھڑی دو گھڑی کی بات نہیں ہے، بلکہ کبھی کبھی تو صرف پنڈال لگانے میں ہفتوں صرف ہوجاتے ہیں۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ کے بیگم حضرت محل پارک میں سیاسی نوعیت کا ایک مشاعرہ وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام پر کیا تھا جس کا پنڈال گیارہ دن میں تیار ہوا تھا اور جس میں دس ہزار کرسیاں اور صوفے رکھوائے گئے تھے۔ فرشی نشست کے لیے پورا پارک موجود تھا۔ اس مشاعرہ کا افتتاح صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم نے کیا تھا اور صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر بروا نے فرمائی تھی۔ پنڈال کے علاوہ بجلی کی اے سی اور ڈی سی دونوں لائنوں کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی لائٹس اور پٹرومکس کا بھی انتظام کرنا پڑا تھا۔ سیاسی اکابرین کے حفاظتی انتظامات کے سبب لاؤڈ اسپیکر کو بھی سرکاری عملہ کے ایک انسپکٹر نے اپنی مہر تصدیق سے نوازا تھا۔ صراحیوں کے بجائے پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ (حالاں کہ سردیوں کا موسم تھا) حقوں کی جگہ سگریٹوں کا انتظام تھا اور سامعین صرف "احباب" تک محدود نہیں تھے، بلکہ انسانوں کا ایک لامتناہی سمندر حد نگاہ تک ٹھاٹھیں مار رہا تھا جن میں جاہل بھی تھے، اور عالم بھی تھے، سیاست داں بھی تھے اور رکشے والے بھی، برقعہ پوش خواتین بھی تھیں اور الٹرا ماڈرن لڑکیاں بھی..... کچھ تفریح کے موڈ میں آئے تھے، کچھ شعر سننے کے لیے..... مگر یہ مشاعرے کا معجزہ تھا

کہ داد و بیداد، تالیاں اور سبحان اللہ ''مکرر ارشاد اور ایک بار پھر عنایت ہو'' سب آوازیں مل کر ایک آہنگ میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ جیسے ہمارے مشاعرے نے مختلف رنگ کے پھولوں کو ایک گلدستے میں تبدیل کر دیا ہو اور مختلف ادبی اور علمی سطح کے لوگوں کی ایک طلسم کے ذریعے شیرازہ بندی کر دی ہو اور جب پانچ چھ گھنٹوں کے بعد یہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر منتشر ہوا تو ہر شخص اپنے معیار نقد و نظر کے اعتبار سے کسی نہ کسی شاعر کو اپنا منظور نظر بنائے ہوئے تھا۔ کم علموں کو اچھے ترنم والے پسند آئے تھے، بے فکروں کو طنز و مزاح نے گرویدہ بنایا تھا، ادبی ذوق رکھنے والے عالموں کو فنی رموز و نکات والے اشعار یاد رہے تھے۔ اردو نہ جاننے والوں کو گیتوں اور ہلکی پھلکی غزلوں نے اپنی طرف ملتفت کیا اور جو لوگ محض تفریح کے موڈ میں آئے تھے وہ شاعرات کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہوئے تھے..... ایک جادو تھا جو سب کے سر چڑھ کر بولا تھا۔ دنیا کے کسی ادب کے پاس ہے کوئی ایسا طلسمی عمل جو ترویج شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کے اسباب بھی فراہم کرتا ہو اور وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر؟ اور صرف یہی نہیں کہ اردو رسم خط جاننے والوں نے اپنے پسندیدہ اشعار دوران مشاعرہ میں لکھ لیے بلکہ اردو نہ جاننے والوں نے بھی دیوناگری خط میں لکھا اور اردو شاعری کے معترف و مداح ہو کر ہندی رسم خط میں اردو شعرا کے مجموعہ ہائے کلام کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ آزادی کے بعد مشاعروں نے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں نہ صرف مثالی کردار ادا کیا ہے بلکہ اردو بیزار حلقوں کو بھی اردو شعر و ادب کا گرویدہ بنایا ہے اور ان لسانی تعصبات کو کم کیا ہے جو رجعت پرست اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے اردو کے سلسلے میں پیدا کیے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ادبی ذوق کی تشکیل میں ہمارے عہد کے شاعروں کا کیا حصہ رہا ہے تو اس کا تجزیہ کرتے وقت بھی ہمیں اپنے دور کے بدلے ہوئے حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جمہوری عہد کے مطالبے شخصی حکومتوں کے مطالبوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب چند امراء، صوفیا یا والیان حکومت کے دیوان خانوں اور محلوں میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور جن میں

ایک مخصوص ادبی سطح کے لوگ محدود تعداد میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں جمہوری نظام نے ادبی مجلس اور حفظ مراتب کے ساتھ ساتھ ادبی اور جمالیاتی ذوق کے معیار میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کردی ہیں۔ وہ دن گئے جب شیروانیاں اور بال والی یا ترکی ٹوپیاں شعرائے کرام کے لباس کا جزولاینفک بن گئی تھیں۔ تقدیم و تاخیر کا روایتی دستور بھی مختلف اسباب کے بنا پر تقریباً منسوخ ہوکر رہ گیا ہے۔ اہم شعرا مشاعرے کے ابتدائی حصے میں اپنا کلام سنانا پسند کرتے ہیں تاکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا عملہ جو ایک مقررہ وقت تک اپنی ڈیوٹی کو انجام دیتا ہے، ان کے کلام کو ریکارڈ کر سکے۔

اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب سامعین کی اکثریت اس نسل کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جسے حالات نے اردو کی تعلیم سے محروم کر رکھا ہے اور جس نے واہ واہ اور سبحان اللہ کے بجائے تالیاں بجانا اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ سامعین کی اس نسل کے ادبی ذوق کی تشکیل جو ''مقرر ارشاد'' اور ''مکرر ارساد'' کے فرق سے بھی واقف نہیں ہے، غالبؔ اور اقبالؒ کے ان اشعار سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی جن کی درجنوں شرحیں پڑھے لکھے باذوق لوگوں کے لیے لکھی گئیں۔ ان کے ادبی ذوق کی تعمیر و تشکیل کے لیے ہمیں دوسرے حربے استعمال کرنے ہوں گے۔ میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ کی غزلیں ابتدائی درجوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں مگر طلبا کے سامنے ان کے مفاہیم کو بیان کرتے ہوئے ہم فنی رموز و نکات کو موضوع بحث نہیں بناتے مگر جب یہی غزلیں ہم ایم۔ اے کے طلبا کو پڑھاتے ہیں تو ان میں طرح طرح کے پہلو پیدا کردیتے ہیں اس لیے کہ طالب علم کی ذہنی اور ادبی سطح ان معنی آفرینیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرچکی ہوتی ہے۔ آج مشاعرے کے سامعین کی اکثریت حالات کے دباؤ سے ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اردو کی شعری اور ادبی روایات سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے عہد کے مشاعروں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اس ادبی، تہذیبی اور جمالیاتی ذوق کی تشکیل کریں گے جو شعری تاریخ میں صدیوں کا سفر طے کرکے قلعۂ معلیٰ نے پروان چڑھائی تھی، ناسمجھی اور کم نظری کی بات ہوگی۔

آج کے مشاعرے خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے ہوتے ہیں اور چند خواص کی آسودگی کے لیے ہزار ہا عوام کو نظر انداز کر دینا جمہوری تقاضوں کے منافی بات ہوگی۔ اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ ادبی نقطۂ نگاہ سے مشاعروں کے وہ کم معیار شعرا بھی جو ترنم اور طرزِ ادا کے زور سے مقبول ہوتے ہیں، سامعین کے موجودہ معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ادبی ذوق کی تشکیل و تعمیر میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ پرائمری درجہ کے استاد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اعلیٰ درجوں کے اساتذہ کی طرح ادبی افکار و مسائل پر گفتگو کرے گا، فضول ہے اور اس سے زیادہ لغو یہ بات ہے کہ ابتدائی درجوں میں جا کر وہ بصیرت افروز لکچر دیئے جائیں جو اعلیٰ درجوں میں دیے جاتے ہیں۔

مشاعرہ عوامی ذوق کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیتا ہے اور ان کے اندر شعر و ادب کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ اعلیٰ ادبی ذوق کی تشفی اور طمانیت کے لیے مخصوص شعری نشستوں کا اہتمام ضروری اور لازمی ضمیمہ ہونا چاہیے۔ یہ توقع رکھنا کہ عوام غالبؔ اور اقبالؔ کی مشکل غزلوں سے اپنے ذوق کی تشکیل کرلیں گے، کم از کم میرے نزدیک تو دور از کار بات ہوگی۔ وہ غالبؔ اور اقبالؔ کو سن ضرور سکتے ہیں بشرطیکہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر کی آواز میں ان کا کلام سنایا جائے مگر ان کی توجہ کلام کی معنویت کی طرف نہیں گانے والے کی آواز کی جانب ہوگی۔

کچھ برسوں قبل اقبال صدی کی افتتاحی تقریب کا آغاز دہلی کے اشوکا ہوٹل میں صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد صاحب نے کیا تھا۔ صدارت، آئی۔ کے گجرال صاحب فرما رہے تھے اور نظامت کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ اس تقریب میں محمد رفیع مرحوم نے اقبالؔ کی دو چار غزلیں سنائی تھیں جسے ساز اور آواز کے زور پر اشوکا ہوٹل کے مہذب اور متمدن سامعین نے سن لیا تھا مگر یکایک کسی منچلے نے یہ فرمائش کردی کہ وہ فلمی گانا سنایئے جس کا مکھڑا ''او دنیا کے رکھوالے'' ہے اور پھر کیا تھا ایک فرد واحد کی فرمائش پورے مجمع کی فرمائش بن گئی اور اقبال صدی کی باوقار تقریب تھوڑی دیر کے لیے فلمی گانوں کی تقریب میں تبدیل ہوگئی۔

یہ اشوکا ہوٹل میں آنے والے خواص کا مجمع تھا۔ میں تو ان عوامی مشاعروں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو نمائش اور میلوں ٹھیلوں میں منعقد ہوتے ہیں۔ یہاں فلمی گانوں کی فرمائش نہیں ہوتی۔ لوگ غزلیں سنتے ہیں، نظموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں..... یہ نظمیں اور غزلیں ادبی نقطۂ نگاہ سے چاہے اچھی ہوتی ہوں یا بری..... مگر اس پر دو رائے نہیں ہیں کہ وہ بہر حال مشاعروں کے موجودہ سامعین کے ادبی ذوق کو بیدار کرتی ہیں اور ان میں اس بات کی آمادگی اور تجسس پیدا کرتی ہیں کہ ادب کے جو بڑے نام انھوں نے سن رکھے ہیں ان کے کلام کی طرف بھی وہ توجہ دیں۔ مشاعرہ میرے نزدیک شاعری کی اعلیٰ ارفع قدروں کی شناخت کا پہلا زینہ ہے اور اپنے محدود دائرۂ کار میں آج بھی عوامی ذوق کی تشکیل و تعمیر میں بھرپور حصہ لے رہا ہے:

سوال: کیا آپ کے نزدیک مشاعرہ اردو غزل، نظم کے ادبی ذوق کی بے توقیری اور اس کی سطح پست کرنے کا سبب بنا ہے؟

جواب: مشاعروں میں جو شعرا شرکت کرتے ہیں ان میں اچھے اور برے دونوں شامل ہیں مگر اچھے اور برے ان میں بھی پائے جاتے ہیں جن کو مشاعروں نے منہ نہیں لگایا ہے۔ ہمارے عہد کی اچھی اور معرکتہ الآرا غزلیں اور نظمیں اکثر و بیشتر مشاعروں ہی کے توسط سے عوامی میراث بنی ہیں۔ اگر انھیں مشاعروں کا پلیٹ فارم نہ ملتا تو وہ صرف خواص تک محدود رہ جاتیں۔ مجازؔ کی ''آوارہ'' اخترؔ الایمان کی ''ایک لڑکا'' وامقؔ جونپوری کی ''بینا بازار'' راہی معصوم رضا کی ''اجنبی'' ساحرؔ کی ''پرچھائیاں'' اور ''تاج محل'' حفیظ جالندھری کی ''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور اسی طرح کی درجنوں نظمیں جن کی بازگشت آج پورے ملک میں سنائی دیتی ہے اپنی عوامی شہرت اور مقبولیت میں مشاعروں کی مرہون منت ہیں۔ یہی صورت حال غزلوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ مشاعرہ غزلوں اور نظموں کے ادبی ذوق کی بے توقیری اور اس کی سطح کو پست کرنے کا سبب بنا ہے، میرے نزدیک درست نہیں ہے۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مشاعرہ کے اسٹیج نے آج تک

کسی خراب نظم یا غزل کو ملک گیر شہرت عطا نہیں کی ہے اور نہ اسے لوگوں کے حافظے میں محفوظ رکھا ہے۔ ادبی ذوق کی بے توقیری اور سطح کی پستی کا شک دلوں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم کسی مشاعرے میں خراب کلام کو کامیاب اور اچھے کلام کو ناکام ہوتے دیکھتے ہیں۔ یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ مشاعرہ کئی عناصر کے ظہور ترتیب کا نام ہے۔ کلام، آواز، طرز ادا، ترنم جب یہ تمام عناصر متوازن انداز میں یکجا ہوتے ہیں تب کہیں جا کے شاعر مشاعرے کے امتحان میں کامیاب ہوتا ہے۔ کلام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر آواز، طرز ادا اور ترنم نہیں ہے تو مشاعرہ اسے رد کر دے گا۔ برخلاف اس کے اگر آواز، طرز ادا اور ترنم موجود ہے اور کلام اوسط درجہ کا ہے تو مشاعرہ ان عناصر کی پذیرائی کے لیے اپنی آغوش وا کر دے گا۔ اس لیے کہ کلام صرف چند پڑھے لکھے لوگوں کا مطمح نظر ہوتا ہے اور آواز، طرزِ ادا، ترنم کا جادو عوام اور خواص دونوں پر چلتا ہے۔ خواص اپنے تہذیبی رکھ رکھاؤ کے باعث اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کلام کی خامیوں کی تلافی، طرزِ ادا اور ترنم سے کر لیتے ہیں مگر وہ لوگ جو کلام کو نہیں پرکھ پاتے اور اکثریت میں ہوتے ہیں وہ آواز، طرزِ ادا اور ترنم کی کمی برداشت نہیں کر پاتے۔

نتیجہ میں اچھا کلام خراب آواز، معمولی طرز ادا اور بے ترنم کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے اور اچھا ترنم، مناسب طرز ادا اور خوش گوار آواز معمولی کلام کو بھی سہارا دے کر آگے بڑھا دیتی ہے۔ اسی لیے اچھے شعرا جو اپنا کلام مناسب طریقے سے پیش کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتے انھیں اپنے کو رسائل اور جرائد تک محدود کر لینا چاہیے اور مشاعروں میں جا کر اپنی بے آبروئی کا اہتمام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا شاعر، مشاعرے میں بھی کامیاب ہو اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مشاعرے کا ہر کامیاب شاعر، اچھا شاعر بھی ہو۔ اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ مشاعرہ ادبی بے توقیری کا آلۂ کار ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ان شعرائے کرام پر عائد ہوتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مشاعرہ صرف شاعر کے کلام کا نام ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ کلام کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی بنیادی مطالبات ہیں جن کا تقاضا مشاعرہ اپنے شعرا سے کرتا ہے۔

سوال: مشاعرے کے اثرات مشاعرے کے لیے شعر کہنے والے شاعر کی شاعری پر آپ کے نزدیک کیا پڑتے ہیں۔

جواب: ہمارے مشاعروں نے معیاری شعرا کی شاعری پر خراب اور غیر معیاری شعرا کی شاعری پر اچھے اثرات ڈالے ہیں۔خراب شعرا کا کلام سامعین کے جذبات واحساسات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اور ان کی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا کاروبار کرتے ہیں اور چوں کہ ان کو یہ احساس برابر ستاتا رہا ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی نہیں ہے اس لیے کبھی کبھی اندھیرے میں جگنو چمک جاتا ہے اور دھوپ میں بوندیں پڑنے لگتی ہیں، مگر ان بدنصیب اچھے شعرا کی قسمت کا کہاں تک ماتم کیا جائے جو وقتی اور عارضی شہرت کی خاطر اپنی مستقل حیثیت کو مجروح کر لیتے ہیں اور ہنگامی واہ واہ کے لیے اپنی بلندیوں سے اتر کر سامعین کی سطح پر آجاتے ہیں۔آج ہمارے مشاعروں میں خراب شعرا تو اپنی سطح پر قائم ہیں یا ان کا فن ارتقا پذیر ہے، برخلاف اس کے اچھے شعرا اپنی سطح سے نیچے بھی اترے ہیں اور ان کا فن زوال پذیر بھی ہوا ہے۔عوامی شہرت کی خواہش جمہوری معاشرہ میں سیاست دانوں کے لیے تو مفید ہوسکتی ہے مگر اکثر و بیشتر اچھے فن کاروں کے لیے سم قاتل بن جاتی ہے۔

سوال: کیا مشاعرے کے ادبی ذوق اور پسندیدگی فضا کی تبدیلیوں کو ظاہر کرتی رہی ہے؟ اگر ایسا ہے تو مثالیں دیں۔

جواب: آزادی کے بعد اردو عوام کا ادبی ذوق معیاری ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ان کا اجتماعی سیاسی شعور گذشتہ ۳۰-۳۵ برسوں میں میں کافی پختہ ہوا ہے جس کا خاطر خواہ مظاہرہ مشاعروں میں ہوتا ہے۔فنی رموز و نکات سے قطع نظر نفس موضوع کے اعتبار سے شاعر کے سیاسی اشعار پر سامعین کا ردعمل حال اور مستقبل دونوں کا اشاریہ ہوتا ہے۔ میں گذشتہ نصف صدی سے مشاعروں میں شعرا کے تعارف کے لیے بلایا جاتا ہوں اور ضمنی طور پر لوگ مجھ سے ایک غزل یا نظم بھی سن لیتے ہیں اور شاذ و نادر ہی دو تین نظموں یا غزلوں کی فرمائش کرتے ہیں۔مگر کانگریس کے زوال کے

فوراً بعد جمسفورڈ کلب نئی دہلی کے ایک مشاعرہ میں جس کی صدارت مسٹر وی شنکر کر رہے تھے، لوگوں نے مجھ سے یکے بعد دیگرے متواتر کئی غزلیں سنیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری پہلی غزل کا مطلع بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا:

تشنہ لبی نے جب بھی ذوق عمل دیا ہے
رندوں نے میکدہ کا ساقی بدل دیا ہے

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مشاعرہ میں جس کی صدارت مسٹر اٹل بہاری واجپئی نے کی تھی، پیش آیا۔ مشاعرہ میں مشاہیر شعرا موجود تھے اور اپنا غیر سیاسی کلام پیش کر رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے اپنی غزل کے دو اشعار پڑھے:

زندگی میں پہلے اتنی تو پریشانی نہ تھی
تنگ دامانی تھی لیکن چاک دامانی نہ تھی
جام خالی تھے مگر مے خانہ تو آباد تھا
چشم ساقی میں تغافل تھا پشیمانی نہ تھی

مشاعرہ شعرا کی اصطلاح میں اُڑ گیا اور متواتر مجھے کئی غزلیں پڑھنی پڑیں۔ جنتا حکومت کے آخری دور میں ایک نظم ''الحمد للہ - ۱۹۷۹ تمام شد'' بے حد مقبول ہوئی، جب میں نے پہلی بار یہ نظم جشن جمہوریہ لال قلعہ دہلی کے مشاعرہ میں پڑھی جس کی صدارت جنتا حکومت کے مرکزی وزیر مسٹر ایڈوانی کر رہے تھے تو سامعین کا ردِعمل اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اب اس حکومت کی شکست و ریخت یقینی ہے۔ نظم کا ایک بند تھا:

خدا کا شکر بجا لائیں اور عرض کریں
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہوا
یہ خانہ زاد حوادث یہ کشت و خون کا سال
جو تشنہ لب تھا مگر تشنگی مٹانے کو

عناد و بغض کے جام و سبو میں شام و سحر
بجائے بادۂ احمر ہماری شہ رگ کا
لہو نچوڑ کے پیتا تھا اور مچلتا تھا
کہیں یہ آگ کہیں یہ دھواں اُگلتا تھا
خدا کا شکر بجا لائیں اور عرض کریں
ترا کرم ہے کہ یہ سال بھی تمام ہوا

ان ذاتی تجربات اور دیگر شعرا کے سیاسی کلام پر سامعین کے ردعمل کو دیکھنے کے بعد بھی یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ مشاعرے میں کلام کی پسندیدگی، سیاسی فضا کی تبدیلیوں کو خاطر خواہ ظاہر کرتی ہے۔

سوال: کیا مشاعرے کے ذریعہ اہل ثروت کی گرفت ادب پر زیادہ ہوئی ہے؟

جواب: یہ کہنا کہ مشاعرہ کے ذریعہ اہل ثروت کی گرفت ادب پر زیادہ ہوئی ہے میرے نزدیک حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ چند مخصوص مشاعروں کو چھوڑ کر جن میں بزم شنکر و شاد (دہلی کلاتھ ملز) اور مودی کے مشاعرے بھی شامل ہیں، زیادہ تر مشاعرے عوامی چندوں سے ہوتے ہیں اور مشاعروں کے اس بیکراں سمندر میں دو تین خوشگوار موجوں کی کوئی خاص اہمیت تعداد کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ان دو مشاعروں میں بھی جو اہل ثروت کے جذبہ وشوق کے آئینہ دار ہیں، عموماً سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی ناہمواریوں کو موضوع گفتگو بنایا جاتا ہے۔ بزم شنکر و شاد کے گلدستے ''دستۂ گل'' کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں اگر آپ ان کا غائرنگاہوں سے مطالعہ کریں تو آپ ایک شعر بھی ایسا نہ پائیں گے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اہل ثروت کی گرفت ہمارے ادب پر زیادہ ہوئی ہے بلکہ معاملہ کچھ الٹا ہی نظر آئے گا اور آپ یہ محسوس کریں گے کہ ان مشاعروں میں ادب نے اہل ثروت کی کوتاہیوں اور خامیوں کی شدید گرفت کی ہے۔

سوال: پچھلے ۳۵ برس کے دوران مشاعروں میں مقبول ہونے والے اہم شعرا اور ان

کے نام؟ ان کی مقبولیت کے اسباب؟

جواب: یہ فہرست کافی طولانی ہے اور اس مختصر سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان تمام شعرا کا تذکرہ کیا جاسکے۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے ہمارے ادب میں مستقل جگہ بنالی ہے اور وہ بھی ہیں جو مشاعروں کی بے پناہ شہرت کے باوجود ادبی محفلوں میں جگہ بھی نہ پاسکے پھر بھی چند نام درج ذیل ہیں مگر یہ فہرست ناقص اور نامکمل ہے:

۱۔ جگر مرادآبادی	دل پر چوٹ کرنے والے اشعار، ترنم، طرز ادا
۲۔ فراق گورکھپوری	کلام، ذہانت، جملہ بازی، اردو کی حمایت
۳۔ خمار بارہ بنکوی	سادہ کلام، حسن اخلاق، ترنم
۴۔ دل لکھنوی	ترنم، خوش پوشی، حسن اخلاق
۵۔ مجاز	کلام، ذہانت
۶۔ جگن ناتھ آزاد	اقلیتوں کے مسائل پر منظومات اور پبلسٹی
۷۔ سلام مچھلی شہری	ادائیں، رومانی کلام
۸۔ ساحر لدھیانوی	طرز ادا، کلام، ڈرامائی انداز
۹۔ شکیل بدایونی	ہلکے پھلکے اشعار، ترنم، فلم گلیمر
۱۰۔ کیفی اعظمی	طرزِ ادا، کلام، ڈرامائی انداز
۱۱۔ ساغر نظامی	رکھ رکھاؤ، کلاسیکی ترنم
۱۲۔ حفیظ جالندھری	ترنم، رومانی کلام، شاہ نامہ اسلام کی شہرت
۱۳۔ انور صابری	ترنم، سامعین سے بے تکلف رابطہ
۱۴۔ روش صدیقی	شرافت نفس، مخصوص لحن، کلام
۱۵۔ بیکل اُتساہی	گیت، ترنم
۱۶۔ انور مرزاپوری	فلمی طرز کا ترنم، ادائیں ہلکے پھلکے اشعار
۱۷۔ بشیر بدر	ترنم، کلام، مشاعرے کو کاروباری سنجیدگی کے ساتھ برتنا

۱۸۔ مجروحؔ سلطانپوری		کلام اور ترنم
۱۹۔ زبیرؔ رضوی		ترنم، گیت، محبوبیت
۲۰۔ شمسیؔ مینائی		موجودہ نظام پر کڑی تنقید
۲۱۔ نشورؔ واحدی		کلام، مخصوص ترنم
۲۲۔ فناؔ نظامی		ترنم
۲۳۔ شمیمؔ کرہانی		اچھی نظمیں اور ترنم
۲۴۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ		نظامت اور جملہ بازی
۲۵۔ جوش ملیح آبادی		گھن گرج، عظمت اور احتجاجی منظومات

سوال: مشاعرے کے بعض دلچسپ واقعات جو آپ کے ساتھ گزرے ہوں۔

جواب: میری زندگی کے گذشتہ پچاس برس مشاعروں کے نام معنون و منسوب رہے اور اس تمام عرصہ میں چھوٹے بڑے شعرا کا ساتھ سفر اور حضر میں رہا ہے۔ صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، مرکزی اور صوبائی وزرا، گورنروں، فلمی اداکاروں، وائس چانسلروں، سفیروں اور سیاسی عمائدین کی صدارت میں میں نے مشاعروں کی نظامت کی ہے۔ دلچسپ واقعات کی ایک طویل فہرست ہے جو ذہن کے دریچوں سے جھانک رہی ہے۔ صرف ایک دلچسپ مگر عبرت انگیز افتتاحی تقریر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ ملک کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار نے غالبؔ صدی تقریبات کے ایک مشاعرہ میں جو یونس سلیم صاحب کی صدارت میں کانپور میں منعقد ہوا تھا، فرمایا تھا:

> ’’بھائیوں اور بہنو! دنیا میں جب جب پاپ پھیلا ہے ایشور نے کسی نہ کسی کو اوتار کے روپ میں دنیا کے سدھار کے لیے بھیجا ہے۔ گالبؔ جی کے جمانے میں بھی پاپ کا گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس لیے بھگوان نے گالبؔ جی کو دنیا میں بھیجا۔ چناں چہ وہ سنسار میں آئے اور اپنی بانیوں سے جیون کے دکھ درد کو دور کیا...‘‘

مشاعرے میں اس تقریر کا استقبال تالیوں سے ہوا تھا اور بانیان نے موصوف کی

گلپوشی بھی کی تھی، اس لیے کہ انھوں نے مشاعرے کے لیے ایک موٹی رقم ''عطیہ'' کے طور پر مرحمت فرمائی تھی۔

سوال: مشاعرے میں شاعرات کی شرکت سے کیا فرق پڑا ہے؟

جواب: شاعرات کی شرکت سے نہ صرف مشاروں کے رنگ و آہنگ میں مزید اضافہ ہوا ہے بلکہ اس ادارہ کی مقناطیسیت کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے۔ غزل اگر غزل سنائے، ساز اگر ساز بجائے، حسن اگر آئینہ دیکھے تو ایک نارمل انسان کا متاثر ہونا نہ کوئی غیر فطری بات ہے نہ الہامی۔ عشقیہ غزلیں جب ایک جوان اور حسین شاعرہ، دست حنائی میں بیاض لے کر، انگلی میں برقی قمقموں کی زد پر جگمگاتی ہوئی انگوٹھی پہن کر، کچھ جاگی اور کچھ سوئی ہوئی شرگیں نگاہوں کے ساتھ ایک ہلکی سی زیرلب مسکراہٹ کے سہارے، دل پر چوٹ کرنے والے ترنم کے ساتھ پڑھتی ہے تو سامعین کے تصورات میں غزل اپنے لغوی معنی تبدیل کر کے عورت کے بجائے مرد سے بات چیت کرنے کا نام ہو جاتی ہے۔ محبوب اپنی جنس تبدیل کر کے عاشق اور عاشق اپنی جنس تبدیل کر کے معشوق بن جاتا ہے۔ ناز و نیاز کے جھگڑے فنا ہو جاتے ہیں۔ حسن اپنی فطرت بدل کر سراپا نیاز اور عشق اپنی فطرت بدل کر سرتاسر ناز بن جاتا ہے۔ محمود ایاز کے امتیاز فنا، حسن و عشق کی تفریق باطل، باوفا اور بے وفا، تغافل اور التفات، طلب اور تجاہل سب کے سب تعینات کے پردے سے باہر نکل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور پھر شاعرہ اپنی شخصیت کی بے پناہ تجلی سے سامعین کی نگاہوں کو چکاچوندھ کر کے ان کے دلوں میں اپنے اشعار اتار دیتی ہے اور وہ واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ شاعرہ کی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں یا اس کے کلام سے مگر جب یہ جلوہ ختم ہوتا ہے اور فضا سکون پرور ہوتی ہے تو اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شاعرہ کے ہاتھ میں جو بیاض ہے وہ دیوناگری رسم خط میں لکھی ہوئی ہے۔ میں ذاتی طور پر مشاعروں میں شاعرات کی شرکت کا مخالف نہیں ہوں مگر یہ امتیاز تو بہر حال برتنا چاہیے کہ شاعرہ واقعی شاعرہ ہو۔ کلام کا اچھا یا خراب ہونا زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے۔ شاعروں میں بھی اچھے اور

خراب دونوں پائے جاتے ہیں۔ زور اس بات پر دیا جانا چاہیے کہ شاعر یا شاعرہ میں شعر کہنے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ تخلیق کی ادبی سطح اونچی یا نیچی ہونا عیب نہیں ہے۔ عیب یہ ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر مشاعروں کی بیشتر شاعرات اردو کی الف، ب، سے بھی واقف نہیں ہیں مگر ہمارے معتبر شعرائے کرام کی سفارشات کو بانیانِ مشاعرہ رد بھی نہیں کر سکتے۔ حسن و جمال کے کچھ حقوق اور مطالبات بھی تو ہوتے ہیں جن کو پورا کرنا بانیانِ مشاعرہ اپنا خوشگوار فریضہ تصور کرتے ہیں۔

سوال: بحیثیت مجموعی مشاعرہ ادب کے فروغ کا باعث ہوا ہے یا زوال؟

جواب: ایک روایت کے بموجب میر نے اپنے عہد کے ڈھائی شاعروں کی عظمت کا اعتراف کیا تھا جس میں وہ خود بھی شامل تھے مگر اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں تھا کہ ان کے دیگر معاصرین قابل اعتنا نہیں تھے۔ دور حاضر کا مشاعرہ بنیادی طور پر لسانی جمہوریت کی توسیع کا عمل ہے اور اپنے اس فریضے کو مشاعرے نے خاطر خواہ انجام دیا ہے لیکن چوں کہ زبان اور ادب کے درمیان ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ بھی موجود ہے اس لیے یہ سوال ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس ادارے نے ادبی اکتسابات کو فروغ بھی دیا ہے یا نہیں۔ مگر ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ادب کی سطحیں بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ میر، غالب اور اقبال کے ساتھ ساتھ جرأت، انشاء، داغ اور جگر کا نام بھی ادبی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ماضی کے جن مشاعروں کی رودادیں ہماری تاریخ نے محفوظ کی ہیں اور مراختوں، مشاعروں اور مسالموں کے جو حوالے ہم کو ملتے ہیں ان کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عہد کے مشاہیر شعرا کے ساتھ ساتھ اس عہد کے اوسط اور معمولی درجوں کے شعرا بھی پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ہیں۔ دورِ حاضر کے مشاعروں میں بھی اکابرین کے ساتھ مبتدی حضرات نظر آتے ہیں، کچھ اچھا کہتے ہیں، کچھ برا کہتے ہیں، مگر برا کہنے والے اچھوں کے مقابلوں میں برے ہیں اور اچھا کہنے والے بروں کے مقابلے میں اچھے ہیں۔ کسی کے کلام میں ماضی کے صنم کدوں کا نور ہے۔ کسی نے عوامی زندگی کے گرد و غبار کو اپنے

سوال: کیا مشاعرے میں نظم کامیاب ہوتی ہے یا غزل ہی کی اجارہ داری ہے؟

جواب: ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی مشاعرے پر غزل کی اجارہ داری برقرار ہے۔نظم گوشعرا کا تناسب غزل گوشعرا کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ رنگِ محفل بدلنے کے لیے پندرہ بیس غزل گو کے درمیان دو ایک نظم گوشعرا رکھ لیے جاتے ہیں اور وہ کامیاب بھی ہیں، مگر داد وتحسین کا وہ ہنگامہ جو غزلوں پر بپا ہوتا ہے، نظموں پر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ دراصل غزل کی ریزہ خیالی اپنا کام فوراً تڑاق پڑاق کرتی ہے اور شاعر ہر شعر کے بعد اپنا صلہ پاتا ہے، برخلاف اس کے نظم چوں کہ تفصیل کے ساتھ ایک مجموعی تاثر پیش کرتی ہے، اس لیے اس کے اختتام ہی پر شاعر کو داد وتحسین ملتی ہے۔

سوال: مشاعرے کے بارے میں آپ کے عام تاثرات اور رسم خط نہ جاننے کے باوجود عوام میں مشاعرے کی مقبولیت کے اسباب؟

جواب: اردو ادب کے پاس مشاعرہ عوام سے براہِ راست رابطہ کا ایک ایسا ادارہ ہے جس سے ذہنوں کی تشکیل وتعمیر اور ترویج شعر وادب دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے دانش وروں نے اس کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جمہوری دور کے تقاضوں اور مطالبات کے پیش نظر شعوری طور پر اس میں مناسب ترمیم واضافے کئے جاتے مگر چوں کہ اس کا کوئی رہبر اور رہنما نہیں تھا اس لیے یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور جمہوریت کی ہوائے خوشگوار پاتے ہی اپنی قوت کے باعث بے ہنگم طریقے سے ایک خودرو جھاڑی کی طرح سے پھیل گیا۔ اگر اس کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کی طرف اب بھی منظم طریقہ سے توجہ دی جائے تو یہ ادارہ بھی زیادہ فعال، متحرک اور متوازن ہوکر عوام کے ادبی ذوق کی تشکیل وتعمیر میں مثالی کردار ادا کرسکتا ہے اور ہمارے بہت سے الجھے ہوئے لسانی مسائل کو حل کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس کا جادو رسم خط کے سہارے نہیں بلکہ سامعہ کے سہارے ان اندھوں پر بھی چلتا ہے جو بہرے نہ ہوں۔

○■○

غزلیات نظیؔر اکبر آبادی
ایک تنقیدی جائزہ

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظیؔر اکبر آبادی کی مجموعی قدر و قیمت کے تعین میں ہمارے تذکرہ نویس اور تنقید نگار جس قدر افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں اس کی مثال ہماری ادبی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ ان لوگوں کو جانے دیجیے جن کے معیار نقد و نظر پر نظیؔر کا کلام پورا نہیں اترتا اور وہ یہ تاثر دے کر گزر گئے کہ وہ ایک ملائے مکتبی، صحت الفاظ سے معریٰ، عوام الناس بلکہ جہلا کی زبان لکھنے والا تھا اور اس کے بیشتر اشعار سوقیوں کی زبان پر جاری رہتے تھے۔ یہاں پر ذکر میں نظیؔر کے ان طرفداروں کا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کے مناقب و فضائل کے سلسلے میں زمین و آسمان کے قلابے ایک کردیے ہیں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظیؔر کے شاعرانہ کمالات کا احاطہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے پیش نظر صرف نظیؔر کی منظومات کو رکھا ہے اور اس کی غزلوں کو نظرانداز کر کے وہ نہ صرف غیرمتوازن تنقید نگاری کا شکار ہوئے ہیں بلکہ ایک ایسی فضا پیدا کردی ہے جس میں نظیؔر کا تصور صرف ایک نظم گو شاعر کا تصور بن کر ہمارے سامنے ابھرتا ہے اور اس کی وہ غزلیں جن کے بعض اشعار محمد حسین آزاؔد کے الفاظ میں میؔر سے پہلو مار جاتے ہیں، ثانوی حیثیت اختیار کرگئی ہیں۔

نظیؔر کے ابتدائی مداحوں کا ایک حلقہ تو مختلف چھاپہ خانوں کے مہتمم حضرات کا ہے جن کی تنقیدی بصیرت پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ ان کے پیش نظر کاروباری مصلحتیں یقیناً رہی ہوں گی اور وہ اپنے مطبع کی جملہ مطبوعات کے بارے میں

عموماً ایک ہی طرح کی رائے دیتے رہے ہوں گے۔ اس گروہ میں محمد وزیر خاں مہتمم مطبع احمدی آگرہ، شیخ نورالدین ابن جیوا خاں مہتمم مطبع صفدری ممبئی اور سید تصدق حسین مصحح مطبع اودھ اخبار کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو ''کلیات نظیر'' کو کتابِ لطف مآب پسندِ ہر صغیر و کبیر کہہ کر اپنی تنقیدی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ میں سید تصدق حسین نے کسی قدر تفصیل سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مصنف با کمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصائح کو چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرمایا ہے۔ خواب غفلت سے دنیا کی میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس طرح حسن ادب سے جگایا ہے..... یہی کلیات ہے کہ اگر چشم ظاہر سے اس کو دیکھو تو طرح طرح دل لگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہے اور اگر دیدۂ حق بین سے بغور و تامل ملاحظہ ہو تو سراسر دنیائے ناپائیدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا گویا بہ سبو ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ اقتباس بھی ایک مجموعی تاثر پیش کرتا ہے اور غزلوں کے بجائے نظیر کی نظموں کا اشاریہ ہے۔ حکمت یار خاں ابن حافظ احمد خاں شاگرد منشی نثار احمد بریلوی بھی جب کلیات کی تعریف کرتے ہیں تو مجموعی طور پر صرف تقلید گذشتگان کا حق ادا کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

> ''کتاب لاجواب، سردفتر شعرائے زماں، سرمشق قلوب عاشقاں کہ جس کو سبّاحِ دریائے فصاحت بیانی و غواص بحر فہم و معانی جناب شیخ ولی محمد اکبر آبادی متخلص بہ نظیر نے اپنی صاف طبع سے نکال کر رشتۂ بحور رنگا رنگ میں منسلک کر کے جوہریان و نقادان بازار معانی کو مستفیض کیا۔''

اس اقتباس سے اگر بحورِ رنگا رنگ کو خارج کر دیا جائے تو تنقید و تبصرہ کی نگاہوں میں اس کی وقعت محض ایک قصیدہ کی مدح کی ہوگی اور بس۔

یہاں پر نظیر کے شاگرد رشید میر قطب الدین باطن کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے "گلستان بے خزاں" میں نظیر کا ذکر کرتے ہوئے سارا زور بیان صرف کر دیا ہے اور ان کو مختلف خطابات سے نوازنے کے بعد لکھا ہے:

"خیاط ازل نے قبائے مضامین نادران کے عقل کے جسم پر قطع کی۔ دبیر فلک نے بیاضِ سخن پردازی و مضمون طرازی ان کے نام بخشی۔ بلاغت میں سلمانِ ساوجی بسم اللہ خوان، دبستان فصاحت میں سحبان بن وائل طفلِ مکتبِ ایشان۔ ان کے چمنِ فکر میں اس طرح کے گلہائے مضامین کھلے ہیں کہ اگر عین خزاں میں بلبلِ تصویر کو اس باغ میں لے جایئے تو ان پھولوں کی بو کارِ نفسِ عیسوی کرے۔ نغمہ سرائی اگر عندلیبِ طبع کی طوطیِ بے جان سنے تو ہزار جان سے نوا سنجِ توصیف و مدح ہو کر ان کا دم بھرے۔ شاعر اس کو کہتے ہیں کہ واقف ہو زمانے کے امورات نیک و بد سے، ہمہ دان شیریں بیاں ہو بڑھ کے حد سے، شعر گوئی کے دقائق سے خوب ماہر ہو، شاعری کے سب نکتوں کا فائدہ اسے ظاہر ہو، شاعری کے عملوں کا عامل ہو، ہر طرز میں مہارت کامل ہو جیسے ہادیِ شعرا، شاعر نامدار، عالی مقدار جن کے کلماتِ شائستہ نے گوشِ فہم عالم کو عقلِ سماعت بخشی۔ کلام نظیر شعرائے عصر کے لیے نظیر ہے، تقریر عاصی بے نظیر ہے۔"

یہ اقتباس اس بات کا شاہد تو ہوسکتا ہے کہ "تقریر عاصی بے نظیر ہے" مگر نظیر کی غزلوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا اور صرف حقِ شاگردی ادا کرتا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ فرہنگ آصفیہ کے مولف منشی سید احمد دہلوی نے جب نظیر کو ہندستان کا شیکسپیئر کہا، یا مولوی نذیر احمد نے جب ان کے اشعار کو ترجمۃ القرآن میں شامل کیا تو ان کی نظروں میں نظیر کی غزلوں کے بجائے ان کی نظمیں تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر فیلن نے

جب نظیؔر کی شاعری کو اہلِ فرنگ کے نصاب کے مطابق سچی شاعری سے تعبیر کیا یا جب اس ضمن میں چوسر اور شیکسپیئر کا ذکر کیا تو ان کا بھی ذہن بنیادی طور پر نظیر کی نظموں پر مرکوز تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ باطؔن سے لے کر شہبازؔ تک اور شہبازؔ سے لے کر عصر حاضر تک جب نظیؔر کے انہام و تفہیم کے نہ جانے کتنے نئے گوشے سامنے آئے اور سماجی پس منظر میں ان کے کلام کی نئی معنویت دریافت کی گئی، ہمارے صاحبان نقد و نظر کا بنیادی طور پر ذہنی جھکاؤ نظیر کی نظموں کی طرف رہا اور ان کی غزلوں سے سوتیلے پن کا برتاؤ کیا گیا۔ وہ چاہے ابوالقاسم میر قدرت اللہ ہوں یا سعادت خاں ناصر، محمود ہوں یا فرحت اللہ بیگ، نظامی بدایونی ہوں یا اجودھیا پرشاد پاٹھک، سب نے بنیادی طور پر اپنے پیش نظر نظیر کے کلام کے اس حصے کو رکھا جو ان کی منظومات پر مشتمل تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی غزلیات پر اس وقت تک بھرپور توجہ، جس کی وہ مستحق تھیں، نہیں کی گئی۔

ان لوگوں میں جنھوں نے ابتداً ہماری توجہ نظیؔر کی غزلوں کی طرف مبذول کرائی، سید محمد آزاد کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’ان دنوں ناسخؔ کے کلام کا مزا دل میں سمایا ہوا تھا۔ نظیؔر نگاہ میں جچتا ہی نہیں تھا..... اب جو دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں نظیؔر کسی طرح میرؔ وغیرہ...... اساتذۂ قدیم سے کم نہیں.....‘‘

ناسخؔ، میرؔ اور دیگر اساتذۂ قدیم کا تذکرہ نظیؔر کے سیاق و سباق میں کرنا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ سید محمد آزاد کے پیش نظر نظیؔر کی غزلیں بھی رہی ہوں گی۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی جنھوں نے ایک روایت کے مطابق نظیؔر کو Realistic Poet کے خطاب سے نوازا، ان کو نظیؔر کی غزلوں کے اشعار یاد تھے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں ’’نگار‘‘ کا نظیؔر نمبر نظیؔر فہمی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ کچھ دیگر مضمون نویسوں کے علاوہ نیازؔ فتح پوری نے جب نظیؔر کے سلسلے میں مرزا مظہرؔ، شاہ حاتمؔ، سوداؔ، میر سوزؔ قائمؔ، حسرتؔ، رنگینؔ، نصیرؔ، ممنونؔ، غالبؔ، ذوقؔ، جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور ناسخؔ وغیرہ کے نام لیے اور یہ لکھا:

''اس لیے اگر اس کے کلام میں وہ سب کچھ پائیں جو اس کے ہم عصر شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے تو تعجب نہ کرنا چاہیے..... وہ بیک وقت متقدمین، متوسطین و متاخرین تمام شعراء کی صف میں جگہ پا سکتا ہے۔''

تو ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ نیازؔ نے نظیر کی غزلوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تذکروں سے لے کر نگارؔ کے نظیر نمبر تک اور نظیر نمبر سے لے کر ہمارے معاصرین تک چند مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر لکھنے والوں کی توجہ نظیر کی منظومات ہی پر رہی جو واقعتاً اردو کی شعری تاریخ میں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہے مگر ان کی غزلوں کا کوئی تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا اور اگر لیا بھی گیا تو محض ضمنی اور ثانوی حیثیت سے۔ اس تغافل اور تجاہل کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نظیر کی غزلیں نا قابل اعتنا تھیں بلکہ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ نظم نگار نظیر اکبر آبادی نے غزل گو نظیر اکبر آبادی کو اس تمام تر عرصہ میں دبائے رکھا اور صاحبان نقد و نظر کی نگاہیں ان کی نظموں کی اجتہادی شان میں اتنی خیرہ ہو گئیں کہ وہ ان محاسن کو نہ دیکھ سکے جو نظیر کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نصف نظیر کے مطالعہ کا اطلاق نظیر کے مکمل فکر و فن پر کیا گیا اور جزو سے کل کو ناپنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی غزلوں کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا کیونکہ بقول حالیؔ ہماری سماجی زندگی میں غزلوں کا عمل دخل اور اس کے اثرات نظموں سے کہیں زیادہ ہیں۔

نظیر کی غزلوں کا سب سے اہم پہلو جو ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے وہ روایتی تصور حسن و عشق ہے جس کی بنیاد محض روایتی، رسمی اور تقلیدی مفروضات پر قائم تھی مکمل انحراف یا بغاوت کا نام ہے۔ یہ ہماری قدیم اردو شاعری کا المیہ رہا ہے کہ وہ اپنے تمام تر اکتسابات اور کمالات کے باوجود زندگی کو اس انداز میں آئینہ نہ دکھا سکی جس انداز میں اسے دکھانا چاہیے تھا۔ اس کا ایک بڑا سبب مجنوںؔ گورکھپوری کے الفاظ میں یہ رہا ہے کہ اس نے اپنے تمام تصورات و مفروضات، اپنے روایات و صور، اپنے اصول و اسالیب

غرض کہ تمام معیار اور تخیل ایران سے لیے اور فارسی شاعری سے اپنا دستور مرتب کیا اور اپنے ملک اور معاشرت سے نہ مواد لیا نہ اسالیب بلکہ ایک دور از خیال موہوم زندگی کو اپنا ماخذ رکھا اور اسی کو اپنا موضوع بنایا۔ نظیؔر پڑھے لکھے آدمی تھے اور انھوں نے اپنی ساری عمر درس و تدریس میں گزاری تھی، اس لیے وہ قدیم شاعری کے اس عاشق کی کوتاہیوں سے خاطر خواہ واقف تھے جو تصورات میں راہ و رسم عاشقی کے نہ جانے کتنے قلعے سر کر لیتا تھا مگر جب محبوب کو سامنے پاتا تھا تو اس کی زبان پر قفل لگ جاتے تھے اور وہ پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ انھیں عاشق کے اس مقفل رویے کا شدید احساس تھا جو شوق کی بلندی اور ہمت کی پستی کے تضادات کا شکار ہو کر شجر ممنوعہ کے ثمر کو چکھنے کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔ عاشق کا یہ تصور جو اس عہد کی شاعری میں ابھر کر سامنے آ رہا تھا، زندگی کے مظاہر اور گرد و پیش میں ہونے والے واقعات کی تردید کر رہا تھا۔ نظیؔر چونکہ روایات و خیالات کے نہیں بلکہ واقعات و حادثات کے شاعر تھے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں نہ تو محبت کی سنی سنائی روداد بیان کی نہ عاشق کی اس ناتجربہ کاری اور شرمیلے پن کو ابھارا جو اس عہد کی اردو غزلوں کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ایک حساس اور زندہ انسان تھے اور انسانی زندگی میں جنس اور جذبہ کی جو اہمیت ہے اس کا عرفان رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ محض حسن بیان اور عروض کے معیارات کسی ادب کی پرکھ نہیں بن سکتے بلکہ ادبی تجربات کی ہمہ جہت کلیت جس میں گہرائی، ہیئت اور اصل جوہر تک رسائی شامل ہے، اچھے ادب کا معیار و میزان ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں محبت کا وہ فرضی اور تخیلی پہلو جس میں کم ہمتی اور مجبوریوں کا نام شرفائے ادب نے پاکیزگی رکھ لیا تھا، پیدا نہ ہو سکا بلکہ محبت کا جنسی پہلو اپنے سارے مد و جزر اور شدت کے ساتھ ان کی غزلوں میں نمودار ہوا۔ ان کی محبوب گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے جس کی شریانوں میں خون دوڑ رہا ہے وہ نہ تخیل کی پیداوار ہے نہ روایات کی پروردہ۔ یہ اردو غزل کے مثالی محبوب کی وہ ہمزاد ہے جس کا ہر عمل اور ردعمل جنس اور شباب کے فطری تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ نظیؔر اپنے محبوب سے مکمل

ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی کے لیے حیلے اور وسیلے تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسن و عشق کی مکمل ہم آہنگی کا نام پارسائی بھی ہے اور محبت بھی اور مکمل ہم آہنگی سے جنس کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا روایتی مزاج نظیرؔ کی زندگی کے اس واقعہ پر شرافت کا پردہ کیوں ڈال دیتا ہے کہ کناری بازار کے ایک کوٹھے سے ایک مہوش نے مسکرا کر کہا:

''میاں! ہم کو اپنا کلام سنا دو۔ یاد کرلیں گے گائیں گے اور کمائیں گے۔''

اس فرمائش پر میاں نظیرؔ بہت جز بز ہوئے۔ اس کا اصرار بڑھ رہا تھا اور وہ ماننے والی نہ تھی۔ کہنے لگے:

لکھیں ہم عیش کی تختی پہ کس طرح اے جاں
قلم زمین کے اوپر دوات کوٹھے پر

دنیا کی بے ثباتی پر نظیرؔ کے اشعار دیکھ کر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ نظیرؔ کی عمر کا بڑا حصہ عیش و نشاط کی محفلوں میں گزرا تھا اور طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی ان کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان کی بہترین غزلیں میاں موجؔ کی وجہ سے مشہور ہوئی تھیں جو ایک مشہور کلاونت اور اس کا شاگرد تھا اور جس نے ان کے ارشاد کے مطابق ان کی دھنیں قائم کرکے دل فریب طور پر گایا تھا۔ ہمیں یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ نظیرؔ نے ایک پوری کتاب اپنے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہونے کے سلسلے میں ''بزمِ عیش'' کے نام سے قلم بند کی تھی۔ گانے بجانے اور بزمِ نشاط کی دھوموں کے تذکرہ میں نظیرؔ کا محاکاتی انداز میں ایسے الفاظ اکٹھا کردینا کہ معلوم ہو کہ مجلس جمی ہوئی ہے اور پکھاوج اور جوڑی کی جوش انگیز آوازیں کانوں میں آرہی ہیں، اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ محض ساحل کے تماشائی نہ تھے بلکہ انھوں نے اس دنیا کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا۔ زندگی کے یہ سارے واقعات اور مشاہدات نظیرؔ کو غزل کے مروجہ رسم و روایت سے انحراف پر آمادہ کرتے ہیں اور وہ اپنے لب ولہجہ اور انداز بیان سے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ زندگی اور زمین ہی کے قریب رہیں اور ان تخیلی طاہر اور پاکیزہ فضاؤں میں نہ جائیں

جہاں فانی اور گنہگار انسان پر بھی نہیں مار سکتے۔ اس کی دنیا حسن کے ان وفاداران ازلی اور غلامانِ کہن کی دنیا نہ تھی جو ایفائے عہد کے انتظار میں ساری ساری عمریں گزار دیتے ہیں بلکہ یہ ان خوش دل جوانوں اور مستانوں کی دنیا تھی جو موجود لمحہ میں زندگی کی لذتوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر پی جانا چاہتے تھے۔ نظیر کی نظمیں ممکن ہے کہ ہمارے بچپن اور بڑھاپے کو متاثر کرتی ہوں مگر جوانی کی اصل فطرت اور جنس کے فطری تقاضے جس پر زمانے کی رفتار نے تہذیب و مدنیت کے ریشمی غلاف نہ چڑھا دیے ہوں، نظیر کی غزلوں میں نظر آتے ہیں جن میں حسن و عشق کی ہم آہنگی کو موضوع سخن بنایا گیا۔ یہ نظیر کا کارنامہ ہے کہ اس نے بغیر کسی نفسیاتی الجھن کے ایک دل کے اچھے اور سچے آدمی کی طرح بڑی صداقت اور بے نفسی کے ساتھ بے جھجک ہوکر، زندگی کے تجربات بغیر کسی حذف و اضافہ کے بیان کر دیے ہیں:

کتنا ہی اس نے تن کو چھڑایا چھڑک چھڑک
پر میں بھی قینچی باندھ کے ایسا چمٹ گیا
یہ کش مکش ہوئی کہ گریباں مرا ادھر
ٹکڑے ہوا اور اس کا دوپٹہ بھی پھٹ گیا
آخر اس بہانے ملا یار سے نظیر
کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا

لپٹ کے سوئے جو اس گلبدن کے ساتھ نظیر
تمام ہوگئیں حل مشکلات کوٹھے پر

اگر ہے منظور یہ کہ ہووے ہمارے سینے کا داغ ٹھنڈا
تو آلپٹیے گلے سے اے جاں جھمک سے کر چھپ چراغ ٹھنڈا

وہ کوٹھے کا مکاں، وہ کالی آندھی، وہ صنم گلرو
عجب رنگوں کی ٹھہری آکے، ہیرا پھیر آندھی میں
اٹھا کر طاق سے شیشہ، لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیے دل سیر آندھی میں
نظیرؔ آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

———

صفائی اس کی جھلکتی ہے گورے سینے میں
چمک کہاں ہے یہ الماس کے نگینے میں
چڑھی جو دوڑ کے کوٹھے پہ وہ پری اک بار
تو میں نے جا لیا اس کو اُدھر کے زینے میں
وہ پہنا کرتی تھی انگیا جو سرخ لاہی کی
لپٹ کے تن سے وہ تر ہوگئی پسینے میں

———

میں نے یہ چند اشعار غزلیات نظیرؔ سے بغیر اس اہتمام کے کہ ان میں ادبی وقار اور فنی رموز و نکات ہیں کہ نہیں، اس لیے منتخب کر لیے ہیں تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ نظیرؔ نے اپنی شخصیت اور فن پر تہذیب و تربیت کے وہ ریشمی غلاف نہیں چڑھائے ہیں جو اس کو ریاکار اور حقیقت فراموش بنا دیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار آپ کے معیار اخلاق پر پورے نہ اتریں اور آپ بھی شیفتہ کی طرح انھیں مبتذل سمجھیں مگر بقول مجنوںؔ گورکھپوری:

''جس چیز کو ہم ابتذال بتاتے ہیں وہی نظیرؔ کا فن ہے۔''

خواص کے مرتب کردہ اصول اور اسالیب کی خاطر وہ عوامی زندگی کے اس گرد و غبار کو جسے وہ اپنے فن اور فکر کا غازہ بنائے ہوئے تھا، قربان کرنے کو تیار نہ تھا۔ کاروبارِ شوق کے یہ مراحل جن کو نظیرؔ نے اپنی غزلوں میں طے کیا ہے ہمیں ان کی فارسی تصنیف ''طرزِ تقریر''

کی یاد دلاتے ہیں جس میں انھوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ معشوقوں سے چھیڑ چھاڑ کیونکر کی جاتی ہے۔

تصورِ حسن و عشق کی یہ تبدیلی صحت مند تھی یا مضر، میں فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر اس پر دو رائے نہیں ہو سکتی کہ یہ اشعار زندگی کے جذب و شوق اور مد و جزر کی آئینہ داری کرتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ معاشرے کی اکثریت کا ایمان اسی طرح کے جذبات و احساسات پر اعمال و افعال کی حد تک قائم تھا۔ بقول ایک تنقید نگار اگر ہمارا ملک ایک جمہوری معاشرہ بننا چاہتا ہے تو ہمیں ادب کے ہمہ جہتی مطالعہ سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ نقد ادب کے فریضہ سے ہم اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جب ہم ادبی تخلیقات کے اندر جاری و ساری روح کے سماجی و سیاسی فلسفے سے آگہی پیدا کریں اور اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواص کے تہذیبی شبستانوں اور ادبی شیش محلوں پر عوامی طرزِ فکر کی یہ پہلی سنگ باری تھی جو میرؔ کے آخری عہد سے شروع ہو کر غالبؔ کے ابتدائی دور تک ہوتی رہی مگر ان نگار خانوں کی فصیلیں اتنی بلند اور مضبوط تھیں کہ اسے مسمار کرنے میں خود نظیرؔ کی جان تلف ہو گئی۔ نظیرؔ خواص کے اقلیم سخن طرازی اور سخن سنجی کا دستور تو نہ بدل سکے مگر عوام کے دلوں اور سماج کے ضمیر پر ان کی گرفت جس قدر شدید اور مضبوط رہی اس کا عشر عشیر تک ہمارے عہد کے ان ترقی پسند شعرا کو نہ مل سکا جو ادب اور زندگی کے رشتہ کو ایک شعوری تحریک سے استوار کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے عہد کے ترقی پسندوں نے عوامی مسائل پر بھی جتنے اشعار کہے اس کو عوام نے کم اور خواص نے زیادہ سراہا۔ یہ سعادت صرف نظیرؔ کے حصے میں آئی کہ خواص ان کی شاعری سے بدظن اور مشکوک ہوئے مگر عوام نے اس کو اپنے دل میں جگہ دی۔ ان کے کلام کے حافظوں میں حلوائی اور کنجڑے، قلندر اور خوانچہ والے، ترکاری اور چنا جور گرم بیچنے والے سبھی شامل ہیں۔ ان کی وفات پر سنیوں اور شیعوں نے اپنے اپنے طریقے سے نماز جنازہ ادا کی، ہندو مزار کی چادر تبرکاً لے گئے۔ شاگردوں نے قبر پختہ کروائی، غلام رسول کی مسجد میں قرآن خوانی ہوئی اور عوام نے جو میلہ قائم کیا وہ آج تک جاری ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں نظیر کی غزلوں کے جس مخصوص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کرنے والے خواص کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کلیات نظیر میں ایسے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جن کے موضوعات میں روایت کے صنم کدوں کا نور شامل ہے مگر ان اشعار میں بھی نظیر نے اپنی ''عوامی انفرادیت'' کو برقرار رکھا ہے اور اپنا رشتہ زندگی کی ٹھوس حقیقت سے منقطع نہیں ہونے دیا ہے۔ انھوں نے اکثر جگہوں پر اپنی تشبیہات و استعارات کو زندگی میں ہونے والے اور نگاہوں کے سامنے گزرنے والے مظاہر سے اخذ کیا ہے۔ ان کی غزلوں کا بیشتر حصہ خارجیت کے مفہوم میں آتا ہے مگر جب کبھی وہ داخلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں تو اس کو ان خارجی علامتوں میں ظاہر کرتے ہیں جو عوامی زندگی اور مشاہدہ کا جزوِ لاینفک ہوتی ہیں۔ ولی دکنی کی اکثر تشبیہات غیر مبہم سے مبہم اور واضح سے غیر واضح کی طرف سفر کرتی ہیں۔ اسی باعث محبوب سے ان کا تخاطب جو عموماً واحد حاضر کے صیغے میں ہوتا ہے اور مادّہ کو آتش گیر بناتا ہے اپنی تشبیہات کی بدولت ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور وہ جمالِ دوست کے وصّاف اور غزلوں کے سب سے بڑے سراپا نگار ہونے کے باوجود جنس کی بھینی بھینی خوشبو سے محروم ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے نظیر اپنے غیر جنسی اشعار میں بھی عوامی زندگی کی ایسی تشبیہات اور استعارات لاتے ہیں جو انھیں خواص کے موضوعات سے قریب تو کرتے ہیں مگر عوام سے دور بھی نہیں ہونے دیتے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں اور روضہ تاج گنج کی زندگی سے اپنی علامتوں کا پیکر لے کر ادب اور جمالیات کی ان قدروں سے ہم آہنگ ہو جانا جو قلعۂ معلّیٰ کے مخصوص ادبی جمالیاتی ماحول میں پروان چڑھ رہی تھیں، صرف میر اور نظیر کا کارنامہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں
چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا ادھر بڑھا لیا

—

موم ہوں میں تو، بتاں مجھ کو نہ سمجھو آہن
ٹک جو تم گرم ہوئے میں تو پگھل جاؤں گا

یوں تو ہم کچھ بھی نہ تھے مثل انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشہ نکلا
محفل میں ہوئی ہوگی، یاد اس کو بہت میری
جب شمع کے شعلے پر پروانہ جلا ہوگا

اور اب یہ تشبیہیں بھی ملاحظہ ہوں:

جھکائے سر کو چپ ہوں یوں میں بحر غم کی لہروں میں
کوئی کھیلے ہے جیسے بازئ شطرنج پہروں میں

اس کے چہرے پہ نہیں کاکلِ مشکیں کی نمود
یہ پٹارے کے تئیں توڑ کے کالا نکلا

اشک کی نوکِ مژہ پر شیشہ بازی دیکھئے
کیا کلائیں کھیلتا ہے بانس پر یہ نٹ پڑا

جو وہ بعد بوسہ کے ناز سے ذرا جھڑکے ہے تو نظیرؔ کو
کبھی مصری ہے کبھی قند ہے کبھی شہد ہے کبھی راب ہے

اگر وہ شعلہ رو پوچھے مرے دل کے پھپھولوں کو
تو اس کے سامنے اک خوشۂ انگور لے جانا
رقیب روسیہ کے حال کا گر ماجرا پوچھے
تو اس کے سامنے جنگل سے اک لنگور لے جانا

ان اشعار میں نفسِ موضوع کے اعتبار سے وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جن پر نظیر سے قبل اردو اور فارسی کے نہ جانے کتنے شعرا خامہ فرسائی کر چکے تھے۔ محبوب کے التفات اور تغافل پر عاشق کی دلی کیفیات کا ردِعمل، آتشِ عشق کا سینے میں فروزاں ہونا، محبوب کے غصے پر عاشق کا رام ہو جانا، شمع کے شعلوں پر پروانے کا جلنا، غم آگیں لمحات میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ جانا، عارض و گیسو کی بات، نوک مژہ پر اشکوں کا فروزاں ہونا، بعدِ بوسہ محبوب کی جھڑکیاں، دل کے پھپھولے اور رقیب کا ماجرا۔ یہ سارے عنوانات ایسے ہیں جن سے ہماری اردو شاعری نظیر سے قبل یا نظیر کے دور میں نا آشنا نہیں تھی، لیکن نظیر نے ان موضوعات کو جن روزمرہ کی زندگی کی علامتوں میں برتا ہے اور تشبیہات واستعارات کی جو عوامی دنیا سجائی ہے وہ نظیر کا اپنا انفرادی رنگ اور امتیازی تجربہ تھا۔ نظیر شعوری طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا رشتہ فنی التزامات میں بھی عوام کی زندگی اور ان کی نگاہوں کے سامنے والے مظاہر سے منقطع نہ ہو۔ پتنگ کا غذی کا اڑانے والے کے اشارات پر گھٹنا بڑھنا، آتش بازی کا تماشہ، لوہے کا گرم ہو کر پگھلنا، شطرنج کی بازی میں کھیلنے والوں کا انہماک، پٹارے سے سانپ کا نکلنا، بانس پرنٹوں کا کرتب، شہد اور راب کا مزا، خوشئہ انگور اور بے ہنگم لنگور، یہ سب معاشرہ کے ایسے مظاہر اور عوامی زندگی کے ایسے مناظر ہیں جن سے سماج کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی واقف ہے۔ نظیر کا یہ آرٹ اگر ایک طرف ان کی غزلوں کو مقامی رنگ عطا کرتا ہے تو دوسری طرف ایسے خواص کی مہذب اور مصنوعی زبان سے انتقام بھی لیتا ہے جو بقول مجنوںؔ گورکھپوری اپنے کو خدا کی خاص مخلوق سمجھتے ہیں اور عوام کو ادنیٰ اور ذلیل سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نظیر یہ جانتے تھے کہ ادب خلا کی پیداوار نہیں ہوتا اور حقیقت اور خبر کی طرح حسن کا تصور بھی ملکوں ملکوں مختلف عہد میں بدلتا رہتا ہے اور ماحول کے تقاضوں اور سماج کے مطالبات کے پس منظر میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے گرد و پیش کی دنیا اور اس عہد کا سماج ان چند خواص پر ہی مشتمل نہیں تھا جنھوں نے ادب اور جمالیات کی قدریں متعین کی تھیں، بلکہ نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی وسیع اور بیکراں

کائنات میں وہ عوام بھی بستے ہیں جن کی اپنی شادکامیاں اور محرومیاں معاشرہ میں مدوجزر پیدا کرتی ہیں اور جو اپنے جذب اور شوق کی آسودگی کے لیے ہمیشہ ایک نظیر کے منتظر رہا کرتے ہیں۔

نظیر نے نہ صرف اپنے فکری میلانات اور فنی اجتہادات سے اردو غزل کو متاثر کیا بلکہ الفاظ کی کثرت اور ترنم، مرادفات کی فراوانی اور موسیقی آمیز بحروں سے اردو غزل کی لسانی جمہوریت کو بہت زیادہ وسیع کیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس میں کوئی دوسرا شاعر ان کے قریب نہیں آتا۔ الفاظ کا شاید اتنا بڑا ذخیرہ میر انیسؔ اور جوشؔ ملیح آبادی دونوں کو شامل کرکے ماضی اور حال میں کسی شاعر کے پاس موجود نہیں رہا۔

نظموں میں عوامی بول چال کے الفاظ کی شمولیت کا مسئلہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا غزلوں میں پیش آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل چھوئی موئی کی طرح نہایت شرمیلی صنف سخن ہے۔ ہلکا سا نامانوس لفظ تغزل کے چہرے پر خراشیں ڈال دیتا ہے۔ یہ نظیر کا کمال ہے کہ ان کے لفظی اختراعات، روزمرہ اور محاورے جب اشعار کے پیکر میں ڈھلتے ہیں تو نہ صرف غزلوں کی موسیقی کو رواں دواں کرتے ہیں بلکہ محاکاتی کیفیت کو بڑھا کر پورا منظر نگاہوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور وہ الفاظ جو اپنی تنہا ذات میں نامانوس، ثقیل اور کھردرے نظر آتے ہیں، مصرعوں میں شامل ہونے کے بعد ایسا مدوجزر پیدا کرتے ہیں اور اتنے روشن اور تابناک ہوجاتے ہیں کہ ان کی چھوٹ سے غزل کا پیمانہ بھی جگمگانے لگتا ہے۔ ذرا ان الفاظ کو دیکھیے جن کا انتخاب نظیر کی صرف غزلوں سے کیا گیا ہے۔ کیا ہماری غزل سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ان الفاظ کی متحمل ہوسکے گی؟ مگر جب آپ نظیر کی غزلوں کو پڑھیں گے تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ فن کار کا طلسمی ہاتھ جہاں بھی لگ جاتا ہے وہاں فعل متحرک اور اسم روشن ہوجاتے ہیں۔

پھنگ، چھٹپن، ملائی، رکھاوٹ، ہتھ پھیر، کھرکھری، ران، بڑبل، کٹھل، کرن پھول، گونگے کا گڑ، فیل بان، دیگ کا چاول، کہنی، گھونسا، لات، بیہودہ، کبڑی، کلیاں، نہان، چڑیل، پھانسی، گندھاوٹ، چھکڑ، لڑاکا، چنچلاہٹ، جھڑاکا، اکھٹ، غٹ، ڈہلوان،

گھلوں، مکڑی، جالا، سرہانہ، پائینتی، بھان متی، چھل بلیا، بادلیا، سانولیا، ڈالیا، پلاؤ، قلیا، بلیا، دلیا، کج ذاتی، پھنک، مراۃ لقا، گل جھڑی، ہموارہ، چوپٹ، کلائیں، بانس، نٹ، پٹ، لب لباب، خطفہ، تکل، سرپیچ، جھوک، چھند بند، بیے، منجھولا، امولا، جھکولا، پولا، کلف، چھل بل انگل، قدوم، گوکھرو، جنگ جو، قتال، گکڑوں کوں، ٹڑوں ٹوں، الن، سڑن، کھطن، بالپن، مزیداری، چپی، رت جگا، سوت، دھاگا، چرخہ، اٹیرین، اٹیرا، منکا، پھونچی، گٹھر، کمپو، جھمکڑا، کٹنی، کھیڑا، تڑبڑا، اچپل، راب، چیکن، دڈی، حقیا، پیچوان، گڑگڑی، پڑری، بکھیڑے باز، تعدی، کوندن وغیرہ وغیرہ۔

یہ چند الفاظ ہیں جن کا انتخاب نظیر کی نظموں سے نہیں بلکہ غزلوں سے کیا گیا ہے۔ مرکزیت، معیار کی بلندی اور دربار سے وابستگی نے اصلاح زبان کے نام پر غزلوں کی لفظیات اور لسانیات کو محدود کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا مگر نظیر کی لامرکزیت اردو غزل کی لسانیات کو لامحدود کر رہی تھی، وہ اپنی غزلوں میں بھاشا، سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی، پنجابی اور پھر اپنے خانہ ساز اور خود ساختہ الفاظ کو بڑی بے تکلفی سے کھپا رہے تھے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ حقیقتیں منجمد لسانی پیانوں میں مجروح ہو سکتی ہیں اس لیے ایک حقیقی فن کار کی طرح انھوں نے اپنی سانسوں کی گرمی سے غریب اور نامانوس الفاظ کو پگھلا کر نہ صرف جیتا جاگتا پیکر عطا کیا بلکہ حقیقتوں کی اس طرح مرقع نگاری کی کہ بین السطور کی خالی جگہیں بھی پر ہو گئیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بقول علامہ سیماب اکبرآبادی موسیقی کو قائم رکھنے کے لیے اگر انھیں عروض یا لسانی قانون کو توڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ مصرعوں کے آہنگ، الفاظ کے زیر و بم، لہجہ کے ترنم اور شعروں کی داخلی اور خارجی غنائی کیفیت کو مجروح و مضروب کر کے عروض اور قواعد کا حق ادا نہیں کرنا چاہتے بلکہ اپنے لفظی اجتہادات اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے غلط تلفظات سے ایسی لے پیدا کر دیتے ہیں کہ قواعد اور عروض دونوں منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظیر نے لسانی نقطۂ نظر سے نہ صرف اپنی آزادی کا اعلان

کیا بلکہ ان بازاری محاورات اور روزہ مرہ سے جن کو استعمال کرتے اور شعرا ڈرتے تھے، ایک بولتا چالتا اچھا خاصا اردو بازار بسا دیا۔ الفاظ ولغات کی کثرت، جدت استعمال اور مختلف صیغوں کے الفاظ کو نظیر نے جس طرح غزل میں داخل کیا ہے اس کی مثال اردو کی پوری شعری تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ یہاں اتنی گنجائش تو نہیں کہ مذکورہ الفاظ اور مرادفات کے استعمال کی مکمل مثال پیش کی جاسکے۔ پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ یکتائی، یہ یک رنگی، تس اوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

شب مہ میں دیکھ اس کا وہ جھمک جھمک کے چلنا
کیا انتخاب مہ نے یوں چمک چمک کے چلنا

کرنے فریب روز جو آتے ہو تم میاں
ہم کو بھی کتنے یاد ہیں اس ڈھب کے چھند بند

میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج
وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اکھٹ گیا

نہ مہ، نہ کوند بجلی کی، نہ شعلے کا اُجالا ہے
کچھ اس گورے سے مکھڑے کا جھمکڑا ہی نرالا ہے

ہزار گل کی بہاریں نہ ہوسکیں ہمسر
تمہارے ایک کرن پھول کی بہار کے ساتھ

نہ جل میں آوے، نہ بھڑ کے نکلے، نہ پاس بیٹھے نظیر اک دم
بڑا ہی پر فن، بڑا ہی سیانا، بڑا ہی شوخ اور بڑا ہی چنچل

کبھی تو ہنس کر شتاب آجا، نظیر کی بھی طرف تک اے جاں
بنا کے سج دھج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

دکھا کر اک نظر دل کو نہایت کرگیا بیکل
پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلی، چلبلا، چنچل

بدن میں جامۂ زرکش، سراپا جس پہ زیب آور
کڑے، بندے، چھٹرے، چھلّے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل

سراسر پر فریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے
شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا چھل بل

فرو کچھ ہو چلا تھا شعلۂ دل
دیا جھپکوں نے پھر مژگاں کی بھڑکا

یہ چند شعر نموناً یہاں پیش کردیئے گئے ہیں ورنہ غزلیات نظیر میں مرادفات اور نامانوس عوامی الفاظ کے خوبصورت استعمال کی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔

نظیر کی غزلیں ان حضرات کے لیے خصوصیت کے ساتھ طمانیت قلب کا باعث ہوں گی جو غزل کی ریزہ خیالی کے شاکی ہیں اور اسے ایک نیم وحشی صنف سخن گردانتے ہیں اس لیے کہ مسلسل غزلوں اور قطعہ بند اشعار کی جو فراوانی کلیات نظیر میں ہم کو ملتی ہے اس سے ہمارا سابقہ کسی اور شاعر کے دیوان میں نہیں پڑتا۔ ان قطعہ بند اشعار میں عموماً

شاعر اور محبوب کے درمیان مکالمہ کا انداز اختیار کر کے ڈرامائی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ مسلسل غزلوں اور قطعہ بند اشعار کی فراوانی اس بات کی بھی علامت ہو سکتی ہے کہ شاعر نے تنگنائے غزل کو بقدر ظرف نہیں پایا اور اسی لیے اس نے ایک خیال کو کئی کئی اشعار میں ادا کیا اور اس ریزہ خیالی کو برت نہیں سکا جو غزل کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے مگر نظیر کے قطعہ بند اشعار اور مسلسل غزلیں ایک دوسری کہانی سناتی ہیں جو بہرصورت عجز بیان کی کہانی نہیں ہے بلکہ اپنا تخلیقی رشتہ نظیر کی نظموں سے جوڑتی ہیں اور ان اثرات کی نشاندہی کرتی ہیں جو شاعر نے اپنے پیش رووں خصوصیت کے ساتھ سوداؔ سے قبول کئے ہوں گے۔ ان اشعار میں شوخی، طراری اور معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ بصائر و تاملات، نصائح سبھی کچھ، ہمیں مل جاتا ہے۔ چند قطعہ بند اشعار کلیات نظیر کی صرف ردیف الف سے ملاحظہ ہوں:

کھول دی چاہ دیدۂ تر نے
یاں نہ لازم پلک بھگونا تھا
اور جو ایسا ہی تھا تو گوہر اشک
ہٹ کے اغیار سے پرونا تھا
یا چھپانا نظیر تھا بہتر
یا تعشق سے ہاتھ دھونا تھا

رات آیا نہ وہ تو کیا کیا کچھ
اہل محفل کو اضطراب ہوا
مے ہوئی خونِ دل صراحی میں
جام مے دیدۂ پُر آب ہوا

رات کوٹھے پہ چڑھا وہ تو کہوں کیا یارو
منظرِ بام سے اس کے وہ اُجالا نکلا
برق جوں چمکے ہے یا چھوٹے ہے جیسے مہتاب
وہ اُجالا تو کچھ اس سے بھی نرالا نکلا

دل دیکھنے کو آیا یارو تو اس صنم نے
ناطاقتی میں اس کے اطوار کو نہ دیکھا
تیرِ نگہ لگایا ایسا نظیر جس کے
پیکاں تو کیا کہ ہم نے سوفار کو نہ دیکھا

نظیر اب سنا ہے کہ اس تند خو نے
کیا بن کے خونخوار پھر قصد یاں کا
جو آتا ہے آنے، دو اس تیغ زن کو
ڈرے وہ میاں ہو خطر جس کو جاں کا

بیٹھ کے نزدیک اس کے جو اک دن پاؤں کو ہم نے چوم لیا
اس نے ہمیں بیباک سمجھ کر لطف جتانا چھوڑ دیا
پھر جو گئے ہم ملنے کو اس کے دیکھ کے اس نے ہم کو نظیر
یوں تو کہا ہاں آؤ جی لیکن پاس بٹھانا چھوڑ دیا

دیا دل نظیر اس کو یوں کہہ کے اے جاں
کہو گے تو یہ پاسبانی کرے گا
پڑھے گا یہ اشعار بیٹھو گے جب تک
جو لیٹو گے افسانہ خوانی کرے گا

بٹھاؤ گے در پر تو ہوگا یہ درباں
لڑاؤ گے تو پہلوانی کرے گا
اطاعت میں خدمت میں فرمانبری میں
غرض ہر طرح جاں فشانی کرے گا

نظیر ہم کو آگے ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا
تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن کفن تھا معطر بدن تھا
جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

یہ چند قطعہ بند اشعار، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، میں نے کلیات نظیر کی صرف ردیف الف سے منتخب کیے ہیں۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے بند دیوان نظیر میں بکھرے پڑے ہیں اور مسلسل غزلوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں موعظت وعبرت، بصائر وتاملات اور کاروبارِ عشق کو موضوع بنایا گیا ہے۔

نظیر کے اکثر قطعہ بند اشعار میں مکالماتی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس کی بنا پر وہ محاکاتی اور ڈرامائی عنصر جو نظیر کی نظموں میں ہمیں ملتا ہے، ان کی غزلوں میں بھی در آیا ہے۔ شاعری سے اگر محاکاتی عنصر خارج کر دیا جائے تو یہ مفروضوں کا ننگا دھڑنگا بیان بن جاتی ہے اور بیان محض کی میکانیکی زبان میں یک رنگی پیدا کرتی ہے۔ نظیر کا محاکاتی اور ڈرامائی انداز نہ صرف ان کو زبان کی یک رنگی سے بچاتا ہے بلکہ پورا منظر نگاہوں کے

سامنے متحرک بنا کر پیش کرتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ ایک محاورے یا ضرب المثل کو نظم کرنے کے لیے نظیر نے پوری پوری غزل اس طرح کہہ ڈالی ہے کہ محاورہ کا مفہوم بالکل اجاگر ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس طرح کے اشعار پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ غزل صرف قطرہ میں دجلہ ہی نہیں دکھلاتی بلکہ قطرہ کو وسعت دے کر دجلہ بھی بنا سکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نظیر کی طبیعت مربوط اور مسلسل کلام کی طرف مائل رہتی ہے اور وہ اپنے کلام سے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ غزل میں بھی ایک مسلسل تجربہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

محمود ہاشمی نے نظیر کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے کہ:

> ''نظیر پہلے ایک پیکر تخلیق کرتے ہیں اور پھر اس کے وجود کی تمام تر لطافت، کو زندگی کا تحرک اور مکالمے کا اعتبار عطا کرتے ہیں۔ ان کی غزل ''میں'' کے وجود سے شروع ہوتی ہے، اپنے مقابل میں ایک دوسرا جمالیاتی پیکر تخلیق کرتی ہے، اُس سے مخاطب ہوتی ہے اور اس طرح دو شعری پیکروں کے درمیان مکالمہ، تصادم، ملاپ، لمحہ، موجود کی لذت اور کیفیت جنم لیتی ہے۔ اس طرح نظیر کا تخلیقی عمل پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔''

نظیر نے اگر ایک طرف اپنی سراپا بیان کرنے والی غزلوں میں اردو شاعری کے مروجہ تصورِ حسن سے انحراف کر کے ایک ایسی عورت کو موضوعِ گفتگو بنایا جو کوئی شریف زادی نہیں بلکہ طوائف ہے اور جس کے وجود کا تمام تر مقصد لذتیت کے ساتھ شہوانی جذبات کی آسودگی فراہم کرنا ہے تو دوسری طرف ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی بے مائیگی کو اجاگر کیا گیا ہے اور پند و نصائح کے دفتر کھولے گئے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ بظاہر تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظیر نے میلوں ٹھیلوں، طوائفوں اور تماش بینوں کے علاوہ درویشوں اور فقیروں کی بھی صحبت اٹھائی ہے۔

نظیر کے مکان کے قریب ہی مولوی احمد شاہ قادری الجعفری رہا کرتے تھے اور مسجد میں شاہ غلام رسول موجود تھے جن کی خدمت میں نظیر وقت کا بڑا حصہ گزارتے تھے۔ ذکر و فکر، تسبیح و مصلیٰ سے کام رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر شیخ کی صحبت میں مضامین تصوف اور جملہ صوفیانہ صفات سے متصف ہو جانا خارج از قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر ان دو عناصر کے علاوہ ان کی تشکیل فکر میں اس تہذیب و تمدن، معیشت اور معاشرت، مشاغل زندگی اور ضروریات انسانی کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے جو گرد و پیش عالم محسوسات میں بکھری ہوئی تھیں۔ نظیر کے کلام کا وہ حصہ جسے مادی زاویۂ نگاہ کا بھی نام دیا جا سکتا ہے اور جو خوش باش زندگی گزارنے اور جسم کے تقاضوں کو اہمیت دینے سے عبارت ہے، ہماری سرزمین کی قدیم ترین ارضی تہذیب سے پھوٹتا ہے۔ جس نے ''تن کی دنیا'' اور زمین کی خوشبو کو تمام تر اہمیت بخشی ہے، مگر ان کے کلام کا وہ حصہ جس میں تصوف اور دنیا کی بے ثباتی پر زور دیا گیا ہے ان آوارہ خرام قبائل کے مخصوص میلانات کا آئینہ دار ہے جو تاریخ کی صبحِ کاذب سے ہمارے ملک کی جانب سفر کرتے رہے اور یہاں کی زندگی، تہذیب اور معاشرت کا ایک حصہ بن گئے۔ اس دھارے نے ایک تنقید نگار کے الفاظ میں ''ارضی میلان کے مقابلے میں ایک آسمانی یا ماورائی اندازِ فکر کو اپنایا اور دنیا اور اس کے لوازم کو چند روزہ اور غیر حقیقی قرار دے کر فقیری، درویشی، مراقبہ، گیان، دھیان اور ترکِ دنیا کی طرف ہمیں مائل کیا۔ انھیں دونوں عناصر کے اتصال اور امتزاج نے ہمارے ملک کی تہذیب کو جنم دیا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ شعری اور ادبی سطح پر اس تہذیب کی بھرپور انداز میں نظیر اکبرآبادی نے مکمل نمائندگی کی۔ ہندو دیوی دیوتاؤں کی طرف نظیر کا ذہنی جھکاؤ بلا وجہ نہیں ہے۔ کرشن سے ان کی ہم آہنگی اس لیے ہے کہ وہ وزیر آغا کے الفاظ میں ''زرخیزی کی بھی علامت ہے اور علم و آگہی کا سرچشمہ بھی۔'' اپنی پہلی حیثیت میں وہ گوپیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے اور دوسری حیثیت میں ارجن کے ساتھ رتھ کی باگیں سنبھالتے اسے حیات و کائنات کے سربستہ رازوں سے آشنا کرتا ہے۔ شیو ایک طرف کیلاش کی چوٹی پر بیٹھ کر گیان دھیان میں مستغرق رہتا ہے اور

دوسری طرف زمین پر اتر کرنٹ راج کا خطاب پاتا ہے۔

نظیر کی غزلوں کے دو اہم متضاد موضوعات جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، غزل کی ریزہ خیالی کے ساتھ ساتھ تہذیب اور معاشرت کے متضاد دھاروں کو بھی ہم آہنگ کرتے ہیں جن کی بہت سی مثالیں قدیم ہندستانی علم الاصنام کی اساطیری شخصیتوں کی عظمت کی آئینہ دار ہیں۔

سید احتشام حسین

کچھ یادیں۔ کچھ آنسو

اب تو یادیں بھی دھندلی پڑ چکی ہیں۔

ہم کب کب اور کہاں کہاں ملے تھے، ذہن کے پردے پر صاف اجاگر نہیں ہو رہا ہے، مختلف کانفرنسیں، ادبی اجتماعات اور مشاعرے آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہے ہیں، ماہ و سال کی گردش اور صبح و شام کے چکر نے خیالات کے دریچوں پر چلمنیں ڈال دی ہیں، مگر ان چلمنوں کے پیچھے ماضی کی یادیں پرچھائیوں کی شکل میں ابھر رہی ہیں، اور میں مختلف سیاق و سباق میں احتشام صاحب کو دیکھ رہا ہوں اور یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے، کہ اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی موجودہ نسل کی تہذیب اور تربیت میں احتشام صاحب کا جس قدر ہاتھ رہا ہے اتنا شاید ان کے معاصرین میں کسی کا بھی نہیں ہے۔ یہ امتیاز انھیں محض اپنے تبحر علمی کی بنا پر حاصل نہیں ہوا، بلکہ اس میں ان کے علم سے زیادہ اُن انسانی خصوصیات کا دخل رہا ہے جو ان کے ساتھ دفن ہوگئیں، علم و ادب کی دنیا میں تو ان سے بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پیدا ہوسکتی ہیں، مگر ان کے شخصی پہلوؤں کی انفرادیت واقعی ایسی تھی جس کی تلافی مشکل ہی سے مستقبل کر سکے گا۔

میں ان کو بہت پہلے سے اور وہ مجھے ۱۹۵۰-۵۱ء سے جاننے لگے جب گورکھپور میں پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور مجھے اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مجنوںؔ صاحب اس وقت گورکھپور میں موجود تھے۔ وہ میرے استاد بھی تھے اور

ترقی پسند نظریات کے علمبردار بھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ ہماری سرپرستی کریں گے اور ترقی پسندوں کے جذباتی غلو کے اس دور میں ہماری رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیں گے مگر ان کی خود پرستی اور انا نے ان کے گرد ایسا حصار کھینچ دیا تھا کہ عوامی زندگی سے ان کا رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا اور انھوں نے خود کو تصنیف و تالیف اور درس و تدریس تک محدود کرلیا تھا۔ اس وقت ہم کچی عمروں کے نوجوان تھے، نعرہ بازی، سیاسی ہنگامہ آرائی اور احتجاج ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا اور فحش نگاری کو ہم ترقی پسندی کی علامت سمجھتے تھے۔ مجنوںؔ صاحب اپنے ہی نشہ میں بدمست اور اپنے ہی جلووں میں سرشار تھے۔ انھیں وہ فرصت و فراغت ہی میسر نہیں تھی کہ ہماری نشستوں میں آتے اور جب ہم کسی مشورہ کے لیے ان کے گھر جاتے تو وہ اپنی علمی اور ادبی فتوحات کا وہ شاہنامہ شروع کردیتے کہ اصل موضوع رکھا رہ جاتا اور ہم ان سے مرعوب ہوکر واپس چلے آتے۔ صحیح رہنمائی نہ ملنے کے باعث گورکھپور کی ادبی تحریک روز بروز جذباتی اور عملی سیاسی سرگرمیوں میں تبدیل ہوتی چلی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھا ادب تو ہم تخلیق نہ کرسکے البتہ ہمارے کچھ ساتھی مختلف ہڑتالوں میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل ضرور پہنچ گئے۔

اس دوران میں لکھنؤ اور بھمڑی (بمبئی) میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسیں ہوچکی تھیں جن میں ہم نے شرکت کی تھی۔ لگ بھگ یہی زمانہ ہوگا جب پہلی بار میرا تعارف احتشام صاحب سے ہوا اور پہلے ہی دن سے ہم نے اپنی ذہنی قیادت کی باگ ڈور احتشام صاحب کے ہاتھوں میں دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ادبی تحریک میں شور اور ہنگامے کے بجائے وہی متین سنجیدگی آگئی جو ان کی فطرت کا خاصہ تھی۔ انھوں نے ہمیں یہ سمجھایا کہ کف درد ہاں ہوجانے کا نام ترقی پسندی نہیں ہے، بلکہ ماضی کی صالح روایات کا احترام کرنا، حال کے تقاضوں پر نگاہ رکھنا اور ایک خوش آئند مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیے فن کے لوازمات کو برتنا صحت مند اور اعلیٰ ادب کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسے ذہن کو جو نعروں سے مرعوب ہورہا تھا اور سوشلسٹ حقیقت نگاروں کے نام میکانکی انقلاب پسندی کو اختیار کرکے، اپنی رومانی لبیک کو آسودہ کررہا تھا، احتشام صاحب کے

تنقیدی نظریات اور سنجیدہ علمی لب ولہجہ نے ٹھہراؤ عطا کیا۔ انھوں نے پہلی بار یہ بتلایا کہ ماضی کو تجزیے کا احترام ملنا چاہیے۔ تاریخ محض جاگیردارانہ نظام کی بے راہ روی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے آئینے میں بھی ابھرتی، مٹتی ٹکراتی، ڈوبتی عوامی آرزوؤں اور طبقاتی کش مکش کو دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں پر اپنے مستقل نقوش چھوڑے بلکہ اپنے ذاتی رو ابط اور سنجیدہ مطالعے کی بنا پر اردو پڑھنے والوں کی ایک مستقل نسل کو اپنے افکار وخیالات سے متاثر کیا اور اس نسل میں ان لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جو ان سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ اس تاثر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی تحریر اور ان کی زندگی میں وہ چونکا دینے والا لب ولہجہ یا وہ مرعوب کرنے والا طمطراق نہ تھا جو ان کے اکثر معاصر تنقید نگاروں میں پایا جاتا ہے بلکہ ان کا شریف النفس استدلال سبک خرامی کے ساتھ مخالفین کے دلوں کو چھوتا ہوا گزر جاتا تھا اور ان کا متین اور سنجیدہ لب ولہجہ لوگوں کے ذہنوں کو منور کر دیتا تھا۔ جامعات ہند کے اردو اساتذہ کی حالیہ کانفرنس میں سید شبیہ الحسن نے تقریر کرتے ہوئے ایک بڑی ہی اچھی بات کہی تھی کہ ہمارے دور کی تنقید کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اس نے کچھ چھوٹے تنقید نگاروں کو جنم دیا جو ہمیشہ بڑی بات کہتے رہے اور کچھ ایسے بڑے تنقید نگاروں کو بھی پروان چڑھایا جو چھوٹی بات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ احتشام صاحب ان متوازن لوگوں میں سے تھے جو اپنے نظریات اور عقاید پر ایمان والعان بھی رکھتے تھے اور بغیر کسی نمائشی انداز بیان کا سہارا لیے ہوئے ان کی تبلیغ و اشاعت بھی آخری لمحے تک کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کے عالم شباب کا ذکر تو چھوڑیے، اس زمانہ میں بھی جب ہمارے ادیبوں کی اکثریت اس بات کا تکرار اور تواتر کے ساتھ اعلان کررہی ہے کہ اب ترقی پسند ادبی دور ختم ہو چکا ہے، احتشام صاحب پختگی کے ساتھ اپنے عقائد کی چٹان پر جمے رہے اور بغیر کسی نفسیاتی الجھن، ذہنی شکست اور ہیجان کے اپنے موقف کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیتے رہے۔ وہ تنہا شخص تھے جنھوں نے جدیدیت کے سیل رواں میں ادب کی بلندترین معاشرتی، روحانی اور اخلاقی قدروں کی وکالت کی۔

احتشام صاحب کے ادبی اور تنقیدی نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس خلوص اور شرافت نفس کی داد دیئے بغیر ان کا کوئی مخالف بھی (اگر کوئی ہو) نہیں رہ سکتا جس کا مظاہرہ انھوں نے ہمیشہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں کیا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے خلوص سے پہلے اور بعد میں اپنے تبحر علمی اور منطقی استدلال سے متاثر کرتے تھے۔ گیارہ سال ادبیات انگریزی کا لکچرر رہنے کے بعد میں نے ۱۹۶۴ء میں جب اردو ادب سے ایم۔ اے کیا تو زبانی امتحان لینے کے لیے احتشام صاحب، گورکھپور تشریف لائے۔ اس پورے عرصے میں میرے اور ان کے روابط کافی بڑھ چکے تھے اور وقتاً فوقتاً خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا جس میں علمی اور ادبی مسائل کے علاوہ نجی اور ذاتی معاملات کو بھی موضوع مراسلت بنایا جاتا تھا۔ رول نمبر کے اعتبار سے جب مجھے ضابطہ کے مطابق کئی طلبہ کے بعد بلایا گیا تو احتشام صاحب نے سب سے پہلے معذرت کی کہ مجھے انتظار کرنا پڑا، اور پھر بڑی دیر تک میری خیریت اور اعظم گڑھ کے حالات دریافت کرتے رہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید انھیں رسمی باتوں کے بعد میری گلوخلاصی ہوجائے گی اور امتحان کے نقطۂ نظر سے مجھ سے سوالات نہیں کیے جائیں گے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ میرے روابط کام آئے اور میرے مبلغ علم کو پرکھنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا کہ یکایک احتشام صاحب بولے ''بھئی ملک زادہ صاحب میں خود بہت دنوں سے چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوتی۔ ہمارے کچھ محترم لکھنے والے امراؤ جان ادا کو محض ایک طوائف کی کہانی سمجھتے ہیں، مگر ہم اس ناول کے متعلق ایک دوسرا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلطی پر ہوں۔ آخر اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔'' اب جو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو مختلف عنوانات پر بغیر کسی رعایت کے انھوں نے مجھ پر پے در پے بوچھار شروع کردی اور غالباً جب وہ پوری طرح مطمئن ہوگئے تب جا کے مجھے نجات ملی۔ اسی طرح جب میں نے ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا مقالہ سپرد قلم کیا تو انھوں نے اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھ کر محاسن اور معائب کی نشان دہی کی اور زبانی گفتگو میں کچھ مفید مشورے بھی دیے۔ ان واقعات کے تحریر کرنے کا مقصد

صرف یہ ہے کہ احتشام صاحب اگر ایک طرف تعلقات کا لحاظ کرتے تھے تو دوسری طرف اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے اور برتتے تھے اور بڑی ہی بے لوث دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے تھے۔ تعلقات اور فرائض کی کش مکش سے کامیاب و کامگار نکل آنا اور وہ بھی اس طرح کہ فرض کی ادائیگی بھی ہو جائے اور تعلقات پر بھی آنچ نہ آئے ایک ایسی سعادت ہے جو احتشام صاحب کے حصے میں بدرجۂ اتم آئی تھی۔

احتشام صاحب مغربی ادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے مگر خود ان کے مزاج کا خمیر مشرق کی آنچ سے اٹھا تھا۔ وہی دل، وہی دل داری، وہی شفقت و مروت، وہی ہمدردی اور محبت جو مشرقی مزاج کا خاصہ ہوا کرتی ہے، احتشام صاحب کی شخصیت میں سرایت کر گئی تھی۔ گذشتہ سال ایک مشاعرہ کی صدارت کے لیے وہ مئوناتھ بھنجن تشریف لائے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ان کے ہمراہ تھے۔ انتظامی مصروفیات کے باعث بانیان تو درکنار کوئی بھی رضا کار ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن نہ جا سکا۔ وہ پسینے میں شرابور اور پیاسے تھے۔ جائے قیام کا پتہ لگا کر جب وہ آئے تو ایک نوکر نے ایک کثیف سے برتن میں لاکر پانی دیا اور وہ بڑی ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کو پی گئے۔ میں سوچنے لگا کتنا عظیم ہے یہ شخص۔ دنیاوی عزت و جاہ اور منصب و شہرت کے باوجود خود کو ہر ماحول میں ڈھال لیتا ہے اور کبر و تمکنت کا کوئی بھی شائبہ اس کے دامن عجز و انکسار کو ملوث نہیں کرتا۔ میں نے ان کو ادبی اجتماعات میں دیکھا ہے، وہ اپنے سے چھوٹے اور کم عیار دانش وروں کی تقریروں کو بھی بڑے ہی انہماک اور توجہ سے سنتے تھے۔ گویا وہ ایسے رموز و نکات کا انکشاف کر رہے ہوں جو احتشام صاحب کے مبلغ علم میں اضافے کا سبب بن سکتے ہوں۔ خوردوں کی احترام آمیز حوصلہ افزائی اور بزرگوں کا عقیدت مندانہ احترام، یہ دونوں محاسن احتشام صاحب کے ساتھ لازم و ملزوم تھے۔ جیپ فلیش لائٹ الٰہ آباد کا مشاعرہ تھا، صدارت کے فرائض ان کے ذمے اور شعرا کے تعارف و ترتیب کا کام میرے سپرد تھا۔ دورانِ مشاعرہ میں ایک بار میں نے ان کو بے چین اور مضطرب پایا۔

وجہ میں سمجھ نہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے، ڈائس سے نیچے اترے جہاں مرزاپور کے ایک سن رسیدہ اور معمر شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس لاکر بٹھلایا اور پھر مطمئن ہوکر مشاعرہ سننے لگے۔ بزرگوں کے ساتھ اتنی عقیدت اور ان کا اتنا احترام، ترقی پسند دور کو احتشام صاحب کا تحفہ ہے۔ انھوں نے مارکس کے جدلیاتی فلسفے کو اپنایا ضرور تھا مگر ہندستانی تہذیب اور اس کی روایات کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔

احتشام صاحب کی سنجیدگی اور متانت کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہنسنے اور ہنسانے کے ذوق سے عاری تھے غلط ہوگا۔ جادۂ اعتدال اور نارمل طریق زندگی سے ہٹے ہوئے لوگ ان کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بنتے تھے۔ وہ ان کی حرکتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ لطف اٹھا سکیں۔ مگر ان کے تمسخر اور طنز میں کبھی بھی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے پس پشت ہمدردی کے جذبے کا ایک سیلاب ہوا کرتا تھا۔ جب ان کے اندر کا ظریف انسان زندگی کے مضحک پہلوؤں کو دیکھ لیتا تھا تو علم و فضل کی تمام تر سنجیدگی بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ یونیورسٹی کے ایک استاد کی بے پناہ معصومیت سے ان کو خصوصی طور پر دل چسپی تھی۔ مختلف کمیٹیوں میں شرکت کے لیے وہ جب بھی آتے تو ان کے علمی اور ادبی اکتسابات کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ گفتگو کا رخ ان چند دل چسپ واقعات کی طرف موڑ دیتے جو اکثر و بیشتر موصوف سے سرزد ہوجایا کرتے تھے اور مجھ سے پوچھتے "بھئی ملک زادہ صاحب ادھر آپ لوگوں نے ان سے کتنی دعوتیں کھائیں اور جب میں ان کی معصومیت کا کوئی نیا واقعہ سناتا تو خوب ہنستے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنا دامن بچاتے ہوئے کہتے "بھئی یہ سب غلط بیانی ہے، وہ بھلا ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ کی داستانیں گھڑ لیتے ہیں۔" آپ یقین فرمائیں اس فرشتہ صفت معصوم استاد کے ایک ایک واقعہ کو وہ تواتر اور تکرار کے ساتھ مجھ سے بار بار سنتے اور محظوظ ہوتے اور پھر یکا یک ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف طنز ملیح میں کرتے ہوئے واقعات کی روایت کی ساری ذمے داری میرے سر پر ڈال دیتے۔

"ایک پروفیسر کو مہمان بنانے کا واقعہ"، "شعبۂ اردو کے دروازے کے پردہ کے گم ہو جانے کا قصہ"، "طلباء کی عدم موجودگی میں ٹائم ٹیبل کی پابندی اور خالی کلاس میں بیٹھے رہنے کی کہانی۔" یہ سارے واقعات جوان معصوم استاد سے متعلق تھے، تمام اساتذہ کی موجودگی میں مجھے اُکسا اُکسا کر سنتے، لطف لیتے اور جب کبھی وہ صاحب سامنے آجاتے تو اُن کی ادبی تخلیقات کی تعریف کرتے اور ان کی شرافتِ نفس کی داد دیتے مگر وہ جس قدر ان سے محظوظ ہوتے تھے اتنی ہی زیادہ ان کی ہمدردیاں بھی موصوف کے ساتھ تھیں اور اسی قدر وہ ان کی محنت اور دیانت داری کے معترف و مداح بھی تھے۔

موت سے کئی ماہ قبل میری ان کی ملاقات الہ آباد میں ہوئی جہاں میں ریڈیو کے مشاعرہ میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ دوران گفتگو میں کسی سفر کا تذکرہ کرنے لگے جس میں ریل گاڑی کا انجن خراب ہو گیا تھا اور گھنٹوں کے بعد درست ہوا، سارے مسافر اتر کر کھیتوں میں چلے گئے، گنے چوسنے لگے اور گانا بجانا شروع ہو گیا۔ بولے "میں عمر کی ان منزلوں میں ہوں جہاں نہ نوجوانوں کی تفریح میں حصہ لے سکتا تھا اور نہ بوڑھوں کی طرح الگ رہ سکتا تھا۔ اسی لیے گاڑی کی تاخیر بہت گراں گزر رہی تھی۔" آج وہ جب ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، میں ان کے ان جملوں کی معنویت پر غور کر رہا ہوں۔ "ریل گاڑی کی تاخیر گراں گزر رہی تھی۔" کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد سفرِ آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔

○■○

عثمان عارف کی غزل

ایک جائزہ

غالبؔ نجم الدولہ اور دبیر الملک تھے، ذوقؔ ملک الشعرا اور خاقانی ہند تھے۔ یہی صورت حال کچھ اور شعرا اور ادبا کی بھی تھی کہ ان کے ناموں کے ساتھ ہمارے تذکرہ نویسوں اور ادبی تاریخ لکھنے والوں نے اُن تمام خطابات اور اعزازات کے لاحقے لگا دیے ہیں جو بادشاہوں یا نوابوں کے دربار میں ان کو عطا ہوئے تھے۔ ان لاحقوں سے ان کی ادبی قدر و قیمت، ان کے سماجی منصب، اور حفظ مراتب کی ان بنیادی قدروں کی نشان دہی ہوتی تھی جو ہمارے ملک اور ہماری تہذیب کا ایک خوش گوار ورثہ ہیں۔ اس لیے اگر میں جناب عثمان عارفؔ کے نام کے ساتھ عزت مآب، عالی مرتبت اور ہزایکسی لنسی کے لاحقے لکھ دوں تو یہ نہ تو کوئی چونکنے والی بات ہونی چاہیے، اور نہ اسے ''غیر تنقیدی'' تصور کیا جانا چاہیے بلکہ یہ ایک روایت کا احترام، ایک سرکاری منصب کی نشان دہی اور ایک پرانی تہذیبی اور ادبی قدر کی بازیافت ہوگی مگر یہ سب لاحقے اور سابقے زیب داستان کے لیے ہوا کرتے ہیں، حقیقی قدر و قیمت کا تعین محمد عثمان عارفؔ کے ان شعری اکتسابات سے ہوگا جس نے ''لمحوں کی دھڑکنوں'' میں ''نورِ زندگی'' بھر کر ''قلم کی کاشت'' کی ہے اور سرزمین شعر و ادب کو سرسبز و شاداب بنایا ہے۔

اس بات پر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ اردو غزل صدیوں کا سفر طے کر کے نئی جہتوں اور نئے امکانات سے آشنا ہو چکی ہے اور اس نے عہد حاضر کی بدلتی

ہوئی نفسیات کے پس منظر میں ان موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن کا تصور ہم قدما اور متوسطین سے نہیں کر سکتے تھے، مگر جن بنیادی عناصر کے امتزاج سے اس کا خمیر اٹھا ہے وہ آج بھی ایک موج تہ نشین کی طرح ہر اچھی غزل کے تخلیقی رویے میں کارفرما ہیں..... وہ چاہے فیضؔ ہوں یا فراقؔ، مجروحؔ ہوں یا فرازؔ، اگر ان کی اچھی غزلوں کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فکری سطح پر ان کی غزل کا رنگ و آہنگ قدما سے ضرور مختلف ہے مگر فنی سطح پر ان کے یہاں بھی اسی روایت کا احترام اور اسی فن کاری کی توسیع ملتی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ایک عہد کے شاعر سے دوسرے عہد کے شاعر کو منتقل ہوتی رہی ہے۔ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرنا، غم جاناں کو غم دیگراں کے سانچے میں ڈھالنا، اور ایک دور کی حقیقت کو ہر دور کی حقیقت میں تبدیل کر کے اشعار کے پیکر میں تبدیل کر دینا، ہر عہد کے خوش فکر شعراء کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور انھوں نے اس امتیازی مقام کو حاصل کرنے کے لیے کبھی رموز و علائم کے طلسمی چراغ روشن کئے ہیں، کبھی بندش الفاظ کے نگینے جڑے ہیں اور کبھی مرصع سازی کا حق ادا کیا ہے مگر وہ موجِ تہ نشین، جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے اور جسے ہم ادبی اصطلاح میں ''تغزل'' کہہ سکتے ہیں، ہر اچھی غزل کے پیچھے کارفرما رہی ہے اور بہت سے سنجیدہ، گمبھیر اور کھردرے موضوعات کو شیرینی، لطافت، غنائیت اور جمالیاتی پیکر عطا کرتی رہی ہے۔ محمد عثمان عارفؔ کی خوش فکری بھی اسی موجِ تہ نشین اور تخلیقی رویے کی مرہونِ منت ہے جس کی چھوٹ سے نہ صرف ان کے فن کا پیمانہ جگمگانے لگتا ہے بلکہ ان کے فکری پہلو بھی تابناک اور منور ہو جاتے ہیں:

فکر پاکیزہ، سبک لفظ ہوں، احساس لطیف
شعر اس رو میں ڈھلا ہو تو غزل ہوتی ہے

لیکن قبل اس کے کہ ہم ان کے تخلیقی عمل اور فنی محاسن پر گفتگو کریں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان موضوعات کی بھی نشان دہی کرتے چلیں جنھیں عثمان عارفؔ نے تنگنائے غزل میں سمویا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ کسی ادبی تقریب میں ان کا تعارف

کراتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ ان کا تخلیقی عمل اردو زبان و ادب کے آغاز وارتقاء کی کہانی کے متوازی چلتا رہا ہے۔ یہ جملہ، مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے رواروی میں کہہ دیا تھا مگر اب جب میں ان کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کر کے یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ رواروی میں کہی گئی یہ بات اپنے اندر ایک ناقابلِ تردید حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کی کہانی میں ان خانقاہوں کا بڑا حصہ رہا ہے جن میں صوفیائے کرام نے اپنے ملفوظات تحریر کئے اور اردو کی ابتدائی نشو ونما میں بھر پور حصہ لیا۔ خانقاہوں سے آگے بڑھ کر اردو کا یہ سفر دیوان خانوں، جامع مسجد کی سیڑھیوں اور عوامی زندگی کے گرد و غبار کا سفر رہا ہے جو اس نے غزل کے توسط سے عشق کی وادیوں میں سینے کے بل چل کر طے کیا ہے۔ عثمان عارف کی غزلوں کا اگر آپ تنقیدی جائزہ لیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ حسن و عشق، تصوف و فلسفہ اور گرد وپیش کے مسائل سے انھوں نے اپنی شاعری کے نگارخانے کو سجایا ہے اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ وہ سنگ میل ہیں جن کے سہارے اردو غزل کا کارواں آگے بڑھا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں انکشاف ذات کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے مسائل کو بھی بے نقاب کیا ہے اور تصوف کی چاشنی کے امتزاج سے عالم انسانیت کے دکھ درد پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ حدیث حسن، حکایت روزگار اور فیضان تصوف اس مثلث کے بنیادی زاویئے ہیں جو عثمان عارف کے رشحات قلم نے صفحۂ قرطاس پر بنائے ہیں۔ یہاں پر اس حسن اتفاق کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کے نام بھی ان معنوی خوبیوں کا اشاریہ بن جاتے ہیں جو ان کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ''نذرِ وطن'' اور ''عقیدت کے پھول'' اسم بامسمیٰ ہیں۔ ''لمحوں کی دھڑکنیں'' اگر روح عصر کے مرادف ہے تو ''نورِ زندگی'' کو اس عشق مجازی اور حقیقی کا متبادل تصور کیا جاسکتا ہے جس کے بغیر زندگی کے کڑے کوس رقصاں اور غزل خواں طے نہیں کئے جاسکتے۔ یہی صورت حال ''قلم کی کاشت'' کی بھی ہے جس کی تطبیق ان کے تخلیقی عمل اور فنی رویے سے ہوسکتی ہے:

حسنِ حبیب، دردِ محبت، غمِ جہاں
عارف جو دل میں ہے وہی شعر و سخن میں ہے

حسن حبیب، درد محبت اور غم جہاں کے یہ رجحانات جو عارف کے اکتسابات میں پائے جاتے ہیں وہ اتفاقی اور حادثاتی نہیں بلکہ ان کی تشکیل فکر جن احوال وظروف میں ہوئی ہے اور اسلاف کا جو ادبی اور تہذیبی ورثہ ان کو ملا ہے اس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ان کے والد جناب محمد عبداللہ بیدلؔ نہ صرف فارسی، اردو اور انگریزی ادبیات کے ماہرین میں سے تھے بلکہ ان کا شمار بیخودؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ بیخودؔ داغ کے شاگرد اور ان کی زبان و بیان کے امین اور وارث تھے۔ شعر وادب سے عثمان عارفؔ کی دل چسپی ان کے گھریلو ماحول کی دین تھی، جو آگے چل کر ان کی زندگی میں ایک نمایاں کردار ادا کرنے والی تھی۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

> ”وکالت، شعر و شاعری اور تصوف مجھ کو ورثہ میں ملے ہیں، تصوف کو اپنی جبلت اور خمیر کا جزو پاتا ہوں، جس میں میں نے سیاست کا اضافہ کیا..... صلحِ کل میرا مشرب، خدمتِ خلق نصب العین زندگی، اور انسانیت میرا دین وایمان ہے۔“

سیاست کا جو اضافہ عثمان عارفؔ نے اپنی خاندانی روایات میں کیا، خدا کا شکر ہے کہ خاندانی روایات ہی نے ان کو منفی میلانات سے بچایا جو دورِ حاضر کی سیاست کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ اگر ان کے اسلاف کے تہذیبی عوامل، دینی اور مذہبی رجحانات نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو ضبط وانقیاد کے دائرہ میں نہ رکھا ہوتا، اور تصوف ان کی جبلت اور خمیر کا جزو نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ دین سے الگ ہو کر ان کی سیاست چنگیزی میں تبدیل ہو جاتی اور ان کے شاعرانہ جذبہ کی شدت نے الفاظ کے پیکر میں ڈھلنے کا کوئی اور عنوان تلاش کر لیا ہوتا مگر یہ ان کے اسلاف کی تہذیبی اور مذہبی قدریں تھیں جنھوں نے ان کی سیاست کو اس حکمت میں تبدیل کر دیا جو انسانیت اور اخلاق کی اعلا ترین قدروں کی مظہر ہے، اور جو شرافت وانسانیت، سچائی اور دیانت داری کا دوسرا نام ہے۔

اردو کی عشقیہ شاعری نے مختلف شعراء کے ماحول اور مزاج کی بناء پر اپنے اظہار کے مختلف انداز اختیار کر لیے ہیں۔ میر و غالبؔ نے بھی عشقیہ شاعری کی ہے اور انشاءؔ و جرأتؔ نے بھی، داغؔ اور امیرؔ نے بھی اپنی فن کاری کے چراغ روشن کیے ہیں اور فیضؔ و فراقؔ نے بھی۔ مگر سبھی کا انداز کلام اور نظریۂ حسن و عشق ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کا کلام جسم کو بیدار اور روح کو خوابیدہ کر دیتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اپنے اشعار کی کرنیں ہمارے دل سے گزار کر ہمارے دماغ کو بھی منور اور مستنیر کرتے ہیں۔ عثمان عارفؔ کی حسن آشنا طبیعت، اپنے ذوق جمال کی تسکین اور آسودگی کے لیے زندگی کے مختلف مظاہر میں حسن و جمال کے سرچشمے تلاش کر لیتی ہے۔ یہ حسن کبھی ان کو محبوب کے پیکر میں نظر آتا ہے اور کبھی لیلائے وطن میں، کبھی مناظرِ فطرت میں اور کبھی جہد و عمل میں۔ مگر حسن و جمال کی یہ جستجو و آرزو صرف خارجی پیکر تلاش نہیں کرتی بلکہ عشق کے ذوقِ نظر کی بھی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے۔ بقول مولانا آزادؔ:

> ''یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سرو سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔''

عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ عثمان عارفؔ زندگی کے کسی مرحلے میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتے، کوئی پیکر ہو، کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، ان کے ذوقِ نظر اور قلب بیدار کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑتی اور یہی تڑپ منظر تلاش بھی کر لیتی ہے اور تراش بھی لیتی ہے:

بدلے ہزار رنگ زمانہ تو غم نہیں
دنیا ہمارے دم سے ہے دنیا سے ہم نہیں

—

پھولوں میں رنگ بھر دیے تاروں میں روشنی
بکھرا ہوا کہاں مرا ذوقِ نظر نہیں

اے برق جہاں سوز تجھے یہ بھی خبر ہے
عاشق کا نشیمن کبھی ویراں نہیں ہوتا

نگاہوں سے تری غنچے کھلے گل ہائے تر ہو کر
بہاریں رنگ لائی ہیں مرا ذوق نظر ہو کر

لوح جبیں پہ چاند ستاروں کی وہ چمک
دل نے مرے چراغ تمنا جلا دیے

ویرانہ وصحرا بھی عارفؔ، خالی نہیں ان کے جلووں سے
محدود نگاہوں میں جلوے محدود گلستاں ہوتے ہیں

رنگِ جہاں کو دیکھئے عارفؔ کی آنکھ سے
نیرنگیاں ہوں لاکھ نظر کامیاب ہے

یہ اور اسی طرح کے درجنوں اشعار جو عارفؔ کے مجموعہ ہائے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں، اس امر کے غماز اور شاہد ہیں کہ حسن کے جلوؤں میں سرمست اور سرشار ہونے کے باوجود انھوں نے ''عشق کی انا'' پر حرف نہیں آنے دیا اور ہر حال میں عشق کی خودداری کی حفاظت کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان عارف کی شاعری کا سب سے اہم حصہ وہ ہے

جس میں انھوں نے ان صحت مند عناصر کو آئینہ دکھلایا ہے جو حسن و عشق کی ہم آہنگی میں مضمر ہوا کرتے ہیں۔ محبت کی زبان میں محبت کی گفتگو کرنا اردو غزل کا ہر دور میں محبوب ترین شیوہ رہا ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی غزل گو ایسا رہا ہو جو ناز و نیاز، ہجر و وصال، شوق و انتظار کے مرحلوں سے اپنا دامن بچا کر نکل گیا ہو، اور اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ راہ و رسمِ عشق و عاشقی کا یہ کوچہ نہایت ہی فرسودہ، روایتی اور پیش پا افتادہ رہا ہے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی مگر اس حقیقت کے باوجود یہ اپنے اندر ایسی کشش رکھتا ہے کہ ادھر سے گزرے بغیر غزل اپنی منزل مقصود تلاش ہی نہیں کر پاتی۔ لوگ جذبات و احساسات کی بیکراں دنیا لے کر آتے ہیں اور اس کوچہ میں نچھاور کر کے چلے جاتے ہیں جہاں ولؔی کا اپنے محبوب سے براہِ راست تخاطب رہا ہو، جہاں میرؔ کی دلسوزی اور دردمندی نے حکمرانی کی ہو جہاں غالبؔ کی ذہانت نے "کیا ہے" اور "کیوں ہو" کی ردیفیں استعمال کر کے فکر و نظر کے نئے پہلو پیش کئے ہوں، جہاں داغؔ اور جگرؔ نے برجستگی اور والہانہ ربودگی کی جولانیاں دکھائی ہوں اور جہاں فیضؔ اور فراقؔ نے حکایتِ روزگار کو حدیثِ حسن بنا کر پیش کیا ہو، اس میں نئے شعرا اس طرح سے کہنا کہ موضوع کی روایتی فرسودگی، تازگی اور انفرادیت کے پہلو پیدا کر لے، کم سعادت کی بات نہیں ہے۔ عثمان عارفؔ کی عارفانہ انگلیوں نے جب ان موضوعات کو چھوا ہے تو یہ فرسودہ مضامین جاگ اٹھے ہیں، اور پرانی شراب ان کے فن کے پیمانہ میں اس طرح ڈھلی ہے کہ نئی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے شعرا عشق مجازی اور عشق حقیقی کے درمیان حدِ فاصل رکھ کر شعر کہتے ہیں مگر عثمان عارفؔ کے یہاں مجاز اور حقیقت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر (جو غزلوں کی ریزہ خیالی کی بنا پر پیدا ہوا ہے) عثمان عارفؔ کی عشقیہ غزلوں کا کوئی بھی شعر آپ لے لیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ بغیر کسی تاویل اور تعلیل کے ان کا رخ بیک وقت حسن مجازی اور حسن حقیقی دونوں کی طرف ہے:

احترامِ حسن کہیئے یا اسے رعبِ جمال
ان کا پردے سے نکلنا تھا کہ میں بے ہوش تھا
تلاشِ یار میں کھو جائیں یہ بھی ایک منزل ہے
نہیں یہ غم نہ پہنچے ہم سرِ منزل تو کیا ہوگا

ہر دو عالم میں تمہارا حسن تھا چھایا ہوا
ہر فسانے کا حسیں عنواں تمہارا نام تھا

میرا مٹ جانا تماشا تھا کوئی؟
آپ سے کس طرح سے دیکھا گیا

اپنے ہی دل کو پھونک لیا سوزِ عشق سے
اپنے ہی گھر کو آگ لگائے ہوئے ہیں ہم

کہیں رکتے نہیں پائے طلب راہ محبت میں
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے ہم ایسا سمجھتے ہیں

یہ چند اشعار میں نے بغیر کسی شعوری کوشش اور التزام کے اِدھر اُدھر سے لے لئے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کی ایک ایک غزل کے اشعار کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ ان کے اشعار میں مجاز اور حقیقت ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوگئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے اور یہی وہ انفرادیت ہے جو عثمان عارفؔ کو دوسرے شعرا سے ممیز وممتاز کرتی ہے۔ مجاز اور حقیقت کی اس متوازن آمیزش کی بنا پر عثمان عارفؔ کی غزلیں ایک پاکیزہ اور طاہر فضا میں سانس لینے لگی ہیں۔

آپ ان کے شوخ ترین اشعار کا انتخاب کرلیجیے، مگر ہر جگہ اس شوخی میں متانت اور سنجیدگی ملے گی:

آنے لگی نظروں میں محرابِ حرم عارفؔ
کیا خوب ہی منظر تھا اس شوخ کی انگڑائی

آج یہ کس کا تبسم بن گیا نورِ سحر
کھل گئیں نرگس کی آنکھیں اور حیراں ہوگئیں

تم آگئے گلشن میں کیا نورِ سحر بن کر
غنچوں کی کھلیں آنکھیں، پھولوں کو ہنسی آئی

یہ عارض ہیں کہ میری صبحِ خنداں
یہ زلفیں ہیں کہ میری شامِ ہجراں

ان اشعار کی تخلیق میں جولہو گردش کررہا ہے وہ آوارگانِ کوچۂ عشق مجازی سے کہیں زیادہ رہ نوردانِ گلشنِ طریقت وتصوف سے کھنچ کر آیا ہے، اور اسی لیے ایک تقدیس اور پاکیزگی عثمان عارفؔ کی غزلوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ ان کی عشقیہ غزلوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی شوخ اور الھڑ حسینہ نے یکایک آنچل سر پر ڈال لیا اور تسبیح وتہلیل میں مصروف ہوگئی ہو۔ یہاں دور دور تک ہوس اور جسمانی محبت کا شائبہ تک نہیں ملتا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہی تہذیبی اور دینی عوامل ہیں جو عثمان عارفؔ کو اپنے اسلاف سے ترکہ میں ملے ہیں۔

عثمان عارفؔ کی شاعری کا دوسرا رخ جو ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کراتا ہے وہ ہے جس میں انھوں نے روح عصر کو بے نقاب کیا ہے اور حکایت روزگار کو حدیث حسن

بنا کر پیش کیا ہے اور زلف گیتی کے پیچ وخم کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ آل احمد سرور نے کہیں لکھا ہے کہ "غزل چاول کے ایک دانے پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے۔" اس کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ عہد حاضر کے گوناگوں کھردرے اور گمبھیر مسائل کو غزل کے نازک آبگینوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ موضوع کی چھوٹ سے فن کا پیانہ بھی جگمگانے لگے، یہ عمل ان فن کاروں کے لیے آسان ہوجاتا ہے جو بادہ وساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق اور قد وگیسو کی اصطلاح میں دار ورسن کی بات کہنے کا گر جانتے ہیں۔ یہی وہ غزل ہوتی ہے جہاں معمولی شاعر حالات کی ناخوشگواری پر کف درد ہاں ہوکر راست اندازِ بیان اختیار کرلیتا ہے اور شاعری کے بجائے نعرہ بازی کا حق ادا کرنے لگتا ہے۔ عثمان عارف اردو غزل کی کلاسیکی روایات سے خاطر خواہ واقف ہیں اور اسی لیے وہ روایتی رموز و علائم میں عصری حسیت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ گرد و پیش کی زندگی کی تاریخی دستاویز بننے کے ساتھ ساتھ اپنی ایک مستقل ادبی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی میں جو ناہمواریاں ہیں ان سب کو وہ اپنے اشعار کا موضوع بناتے ہیں اور شاعرانہ انداز میں ان کی کڑی گرفت کرتے ہیں تاکہ وہ معاشرہ پیدا ہوسکے جس کا خواب ہمارے اسلاف نے دیکھا تھا۔ ان کی سیاسی وفاداریاں اور ان کی جماعتی ترجیحات ان کو اس بات پر آمادہ نہیں کرتیں کہ وہ محض ان مثبت اقدار کی ترجمانی کرکے رہ جائیں جو ہماری پیش رفت کا سبب بنی ہیں بلکہ وہ شاعرانہ بے باکی اور بے خوفی سے ان منفی میلانات پر بھی ضرب کاری لگاتے ہیں جو ہماری روزانہ کی زندگی میں در آتے ہیں:

صراحی ہے، نہ مینا ہے، نہ صہبا ہے، نہ ساغر ہے
یہ کن ہاتھوں میں عارف میکدہ کا انتظام آیا

ہمارا نام تو عنوانِ داستاں تھا کبھی
ہمارا ذکر ہی اب ان کی داستاں میں نہیں

رہبروں نے دور کردیں رہزنوں کی مشکلیں
کارواں منزل پہ لٹ جاتے ہیں آسانی کے ساتھ

اہل چمن کی حرکتیں حد سے گزر گئیں
بدنام ہورہا ہے گلستاں کا نام بھی

تجھے ملال نشیمن رہا نہ گلشن میں
مجھے ہے فکر بہاریں ہی گلستاں میں نہیں

حیراں کھڑے ہوئے ہو تماشا بنے ہوئے
عارفؔ یہ تم نے دیکھ لیا کیا بہار میں

ہوتی ہے خیالوں میں ہی تنظیم چمن کی
کردار ہی بدلے ہیں نہ گفتار ابھی تک

ان اشعار کا جو غیر متزلزل اور غیر مشروط شاعرانہ لب ولہجہ ہے وہ اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ شاعر عثمان عارف نے سیاست داں عثمان عارفؔ کو شکست دے کر زیر کرلیا ہے۔ یہ رمز عثمان عارفؔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شعر اور سیاست کی اس آویزش میں اگر شعری صداقت کا خون ہوگیا تو علم و ادب اور انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا خون ہوگا جب کہ سیاست کی شکست محض کسی مخصوص سیاسی تنظیم کے روزانہ بدلتے ہوئے مصلحت آمیز رویے کے خون کے مرادف ہوگی۔

عثمان عارفؔ کی شاعری میں یوں تو بصائر اور تاملات کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں لیکن جو چیز بڑی آن بان کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ ان کی بے پناہ رجائیت

ہے۔ بادِ مخالف کی زد پر امید کی شمع اس اعتماد کے ساتھ جلانا کہ آخر فتح کی روشنی ہوگی، ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ایک ایسے دور میں جب، کہ بیشتر شعرا انفعالیت، اضمحلال اور پژمردگی کا شکار ہیں، جب بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کا ماتم کیا جارہا ہو، جب تنہائی کا کرب رہائشی کمروں سے نکل کر بازاروں میں پھیل رہا ہو، عثمان عارف کے لیے یہ سعادت کم نہیں ہے کہ وہ اپنی شاعری میں ان اقدار کی شیرازہ بندی کر رہے ہیں جو اسلاف نے اخلاف کو منتقل کی ہیں۔ حق و باطل کی ستیزہ کاری میں عزم و عمل کے سہارے زندگی کے کڑے کوسوں کو آسان کر کے منزل مقصود پر پہنچ جانے کا غیر متزلزل اعتماد و یقین جو ان کے کلام میں ملتا ہے وہ ہمارے عزم و حوصلہ کو مہمیز کرنے کے علاوہ مایوسی، ناامیدی اور محرومی سے ہمیں نجات دلا کے ہمارا تزکیہ نفس بھی کرتا ہے:

اٹھیں موجیں خدا پر میں بھروسہ کر کے کہتا ہوں
مجھے طوفان کو ساحل بنا دینا بھی آتا ہے

اے دوست اب نہ چین سے بیٹھیں گے عمر بھر
بدلیں گے اس کو گردشِ ایام ہی تو ہے

حیات روز نئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سیکڑوں چراغ جلے

رفتار پر ہماری رفتارِ زندگی
ہم چل پڑے جدھر بھی چلتا گیا زمانہ

منزل کی خاک دیکھ لیں میرے غبار سے
اڑتی ہے میری خاک ابھی تک دبی نہیں

آنکھیں تو ملا، دیکھ ادھر گردش دوراں
جینے کا مزہ حوصلہ والوں کے لیے ہے

اپنی بے پناہ رجائیت، اپنے طاہر اور پاکیزہ لہجہ کی بنا پر محمد عثمان عارفؔ کی غزلیں پہچانی جاسکتی ہیں۔ شباب کی سرمستی ہو یا شراب کی بدمستی آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، تصوف ہو یا فلسفہ، شریعت ہو یا طریقت، سوز باطن ہو یا حسنِ ظاہر، مجاز ہو یا حقیقت، کوئی بھی موضوع ہو، جب الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر ان کے یہاں شعر بنتا ہے تو اس کے چاروں طرف ایک طاہر اور پاکیزہ شائستگی چھا جاتی ہے۔ شراب ناب کا ذکر ہے مگر وہ ساقی کے جام سے نکل کر جہاں ان کے اشعار کے پیمانہ میں آئی، شراب معرفت بن گئی۔ الفاظ کا یہ طاہر انتخاب، بندشوں کا یہ سحر حلال، صنائع و بدائع کے یہ تصرفات اور رموز و علائم کے یہ طلسمی چراغ جو کافر موضوعات کو مسلمان کرلیں، جو رند کو عبا قبا بخش دیں، محمد عثمان عارفؔ کی غزلوں کے کشف و کرامات ہیں۔ انھوں نے قدما کے کلام کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور اس کے بعد ماضی کی تمام صالح روایات کو اپنے کلام کے اندر جذب کرکے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ موجودہ عہد کے تقاضوں کے پیش نظر اپنی ایک راہ نکالی ہے جو جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم اور قدیم ہوتے ہوئے بھی جدید ہے۔ وہ طاقتِ عمل سے نکھرا ہوا زندگی کا چہرہ آئینۂ ایام میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

وہ نہ صرف لغت، معانی اور عروض کے نکات سے خاطر خواہ واقف ہیں بلکہ ان کی شاعری میں روح اور بیان کی حرارت، ان کے جذبے میں گرمی اور نرمی کا امتزاج اور ان کے تخیل میں شعریت اور صداقت کی بڑی متوازن کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ صرف ماحول کی خام کاریوں کو بے نقاب نہیں کرتے بلکہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ زندگی کی وہ کون سی قدریں ہیں جن سے ہم محبت کریں اور کون سے وہ رجحانات ہیں جو نفرت کرنے کے قابل ہیں۔ مجموعی طور پر دانتے کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ:

''میں نے ان کی (غزلوں کی) گہرائیوں میں کائنات کے
بکھرے اوراق کو اکٹھا دیکھا، جن کی محبت نے شیرازہ بندی کی تھی
جو ہر، عارضی خصوصیتیں اور ان کی مناسبتیں سب چیزیں کچھ
اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ دیکھنے میں بس ایک واحد شعلہ نظر
آتا تھا۔''

غزل گاؤں کا شاعر

منور رانا

کہا جاتا ہے کہ جب ڈپٹی نذیر احمد کے معیارِ اخلاق پر اردو کا ادبی سرمایہ پورا نہیں اترا تو انھوں نے بچوں کی تعلیم کے لیے دو چار صفحات روزانہ لکھنے شروع کیے۔ یہی صفحات مجتمع ہوکر اردو کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' بن گئے۔ اگر ناول کے کردار، مصنف کے نظریات اور خیالات کے غماز ہوتے ہیں تو موصوف ہمارے شعری سرمایہ سے اتنا بددل تھے کہ ان کے نزدیک بہت سے وہ دواوین جن پر آج ہم بجا طور پر فخر کرتے ہیں محض اس لیے جلا دینے کے قابل تھے کہ وہ اس تہذیبی رکھ رکھاؤ سے محروم تھے جو نذیر احمد کے نزدیک شرفا کا دستور العمل ہوا کرتا ہے۔ کاش وہ ہمارے عہد میں ہوتے تو میں بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جب تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت زندگی کے معمولات میں شامل ہوگئی ہے، ان کو غزلوں کا ایک مجموعہ پیش کرتا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ اس مجموعہ کو ریشمی جزدان میں رکھتے اور اپنے گھر کی بہو بیٹیوں سے کہتے کہ روزانہ اس کی تلاوت کیا کرو، تا کہ تمہاری زندگیاں سنورتی رہیں اور یہ مجموعہ ہوتا کلکتہ کے ابھرتے ہوئے فنکار منور رانا کا جو میرے نزدیک گاؤں کی راحتوں، شہر کی صعوبتوں اور ماں بہنوں کی تقدیس اور عصمتوں کا شاعر ہے۔ فانی کے نزدیک غمِ روزگار کا واحد علاج موت ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں موت کا تصور ہیبت ناک ہونے کی بجائے خوب صورت اور خوشگوار ہوگیا ہے۔ منور رانا گاؤں سے شہروں کی طرف

ہجرت کو قدروں کی بربادی کا پیش خیمہ اور شہروں سے گاؤں کی طرف مراجعت کو قدروں کی بازیافت کا وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ گاؤں اور شہر کی یہ آویزش منور رانا کے نزدیک محض دو جغرافیائی حد بندیوں کی آویزش نہیں ہے بلکہ دو طرز فکر، دو معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی جنگ ہے۔ یہاں پر انسان کی فطری معصومیت مصنوعی معاشرتی زندگی سے نبرد آزما ہوتی ہے اور پھر وہ سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی انقلابات سے جکڑے ہوئے شہروں کے چکر میں ایسا گرفتار ہو جاتا ہے کہ گاؤں اس کے لیے ایک خواب اور شہر اس کے لیے زندگی کی ایک تلخ اور سنگین حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے جہاں اس کے جذب وشوق کے بلبلے ٹوٹتے رہتے ہیں اور وہ اپنی اخلاقی قدرں کا جنازہ اٹھائے ہوئے افتاں وخیزاں، حیران و پریشان، کراہتا ہوا زندگی کا سفر طے کرتا رہتا ہے۔ یہاں وہ فانی کی طرف موت کو نہیں بلکہ گاؤں کو یاد کرتا رہتا ہے۔ زندگی کے وسیع ریگستان میں گاؤں سایہ دار درختوں اور ٹھنڈے پانیوں کا نخلستان ہے۔ یہ درخت ان کی تہذیبی قدروں کے درخت اور یہ چشمے ان اعلیٰ وارفع عقائد ونظریات کے چشمے ہیں جو ہمارے ملک نے ماہ وسال کی گردش کے باوجود صدیوں سے امانت کے طور پر محفوظ کر رکھے ہیں اور جن سے ہمارا تمام تر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیوں کے باوجود ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے:

سونے پنگھٹ کا کوئی درد بھرا گیت تھے ہم
شہر کے شور میں کیا تجھ کو سنائی دیتے

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی رو پڑی
غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنویں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

بڑے شہروں میں بھی رہ کر برابر یاد کرتا تھا
وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

بھیک سے تو بھوک اچھی گاؤں کو واپس چلو
شہر میں رہنے سے یہ بچہ برا ہو جائے گا

ہمیں مزدوروں کی محنت کشوں کی یاد آتی ہے
عمارت دیکھ کر کاری گروں کی یاد آتی ہے

وہ ایک شخص جو بچپن سے میرے گاؤں میں ہے
یہ جانتا نہیں کوئی کہ دیوتاؤں میں ہے

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

نہ جانے کون سی مجبوریاں پردیس لائی تھیں
وہ جتنی دیر بھی زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا

جو اپنے گاؤں کی پگڈنڈیوں پہ چھوڑ آئے
چھپی ہوئی مری عظمت اُسی کھڑاؤں میں ہے

یہ اور اسی طرح کے دیگر اشعار جو منور راؔنا کے مجموعۂ کلام میں بکھرے ہوئے ہیں اس امر کا واضح اشاریہ بنتے ہیں کہ گاؤں کا تصور ان کی شاعری میں محض اپنے فطری مناظر کے حوالے سے نہیں اُبھرتا بلکہ ان تمام تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے جو گاؤں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ معصومیت، سادگی، بھولا پن بے ریائی اور خلوص جو گاؤں کے خمیر میں شامل ہے، یہ سارے عناصر منور رانا کے گاؤں میں نظر آتے ہیں۔ یہاں پر یہ اشارہ بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ گاؤں کے ساتھ منور راؔنا کی یہ جذباتی اور والہانہ وابستگی ان کی شخصیت اور تشکیلِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے پریم چند کو دیکھ کر یہ کہا تھا کہ منشی جی آپ گاؤں والے سے زیادہ خود گاؤں معلوم ہوتے ہیں۔ پریم چند نے قطع کلام کرتے ہوئے لقمہ دیا تھا گاؤں نہیں بلکہ گاؤں کا گھورا اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب گاؤں کا کوڑا کرکٹ گھورے پر جمع ہوکر کھاد بن جاتا ہے تو اس پر زندگی کے پھول کھلتے ہیں۔ منور راؔنا ظاہری اعتبار سے نہ گاؤں معلوم ہوتے ہیں نہ گاؤں کا گھورا، لیکن گاؤں اپنی جن قدروں کے لیے مشہور ہے وہ منور راؔنا کی سرشت میں داخل ہیں۔ اسی سادہ لوحی اور بے ریائی سے جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے منور راؔنا کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے اور وہی ان کی تشکیل فکر وفن میں بھی ساری ہے۔ آپ منور راؔنا کا کوئی شعر غیر فطری لب ولہجہ کا نہیں پائیں گے۔ ان کی فن کاری بندش الفاظ کے نگینے جڑنے والوں اور کاریگرانِ شعر کی فنکاری نہیں ہے بلکہ وہ بے ساختہ دل کی بات بغیر کسی تصنع اور تکلف کے زبان پر لاتے ہیں اور یہی سادگی اور خلوص سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ جس طرح درخت پر نئی کونپلیں آتی ہیں اسی طرح اشعار منور راؔنا کے نوکِ قلم پر فطری انداز میں آتے ہیں اور چونکہ معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی مگر اہم باتوں کا تذکرہ وہ اپنی غزلوں میں کر جاتے ہیں، اس لیے موضوع کی ندرت قاری اور سامع کو چونکا دیتی

ہے۔ حالیؔ نے اس بات کی شکایت کی تھی کہ ہماری غزلیں چند بندھے ٹکے موضوعات تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالیؔ سے حال تک غزلوں کے موضوعات میں بے پناہ اضافے ہوئے ہیں مگر ان اضافوں کے باوجود منور راناؔ نے بہت سے نئے موضوعات کو غزلوں میں شامل کر کے ان کی فکری جمہوریت کو وسیع کیا ہے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھئے اور یہ سوچئے کہ منور راناؔ کے علاوہ ان کو کس نے ہاتھ لگایا ہے:

سفیدی آگئی بالوں میں اُس کے
وہ باعزت گھرانہ چاہتا تھا

بڑی بے چارگی سے لوٹتی بارات تکتے ہیں
بہادر ہو کے بھی مجبور ہوتے ہیں دلہن والے

گفتگو فون پہ ہوجاتی ہے راناؔ صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکا جاتا

ابھی تک میرے قصبے میں کئی ایسے گھرانے ہیں
کبھی رمضان میں مسجد سے افطاری نہیں لاتے

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے ہیں اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

اب دیکھئے کون آئے جنازے کو اٹھانے
یوں تار تو میرے سبھی بیٹوں کو ملے گا

جس کو بچوں میں پہنچنے کی بہت عجلت ہو
اس سے کہیے نہ کبھی کار چلانے کے لیے

کسی بچے کا یہ جملہ ابھی تک یاد آتا ہے
یتیموں کو پڑھانے کوئی استانی نہیں جاتی

کس دن کوئی رشتہ مری بہنوں کو ملے گا
کب نیند کا موسم مری آنکھوں کو ملے گا

بستے کی جگہ پیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہوں
اُن بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

موضوعات کا یہ اچھوتا کنوارا پن، اور اسی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی کے ساتھ برجستہ انداز میں انھیں نظم کر دینے کا فن منور رآنا کا امتیازی کارنامہ ہے جس کی مثالیں ان کے معاصرین میں کم ملتی ہیں۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ منور رآنا ماں بہنوں کی تقدیس اور عصمتوں کا شاعر ہے۔ مذہبی اکابرین نے ماں کی تقدیس اور عظمت کے بارے میں چاہے جو کچھ بھی کہا ہو مگر میں بلا جھجک یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اردو غزل میں ابتداء سے آج تک ماں کے موضوعات پر کسی شاعر نے اتنا نہیں کہا ہے جتنا منور رآنا نے اپنے مختصر سے شعری سفر میں کہہ ڈالا ہے۔

شاعروں کو اپنی محبوباؤں سے فرصت ہی کہاں ملی کہ وہ ماں بہنوں کی جانب توجہ دیتے۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں ان رشتوں کی محبتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے مگر ان کا یہ خواب اب جا کر منور رآنا کے کلام میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ماں سے منور رآنا کی یہ

عقیدت اور احترام کچھ تو ان مذہبی روایات کی وجہ سے ہے جو مسلمانوں کے متوسط گھرانوں میں ضرب المثل بن چکی ہیں اور کچھ اس بنا پر بھی ہے کہ ان کی ماں نے اپنی تمام تر شفقت اور محبت سے نواز ہے۔ مگر ان دونوں عوامل سے زیادہ وہی بے لوثی، معصومیت اور بے ریائی ہے جو اگر ایک طرف ان کو گاؤں کی طرف والہانہ انداز میں کھینچتی ہے تو دوسری طرف اُن کو ماں کے ان قدموں پر سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور کرتی ہے جن کے نیچے جنت ہے۔ گاؤں کے سایہ دار گھنیرے درخت اور ماں کے آنچل کا سایہ منور رانا کی ایک نفسیات کے دو رخ ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ماں اور فطرت دونوں بے ریا اور بے لوث ہیں۔ دونوں زندگی کی جنگ میں کھائے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور منور رانا نے چونکہ زندگی کے مد و جزر کا تماشا ساحل سے نہیں دیکھا ہے بلکہ موجوں کے تھپیڑے برداشت کئے ہیں اس لیے ماں اور فطرت (جس کی نمائندگی گاؤں کرتا ہے) دونوں کی آغوش کی طرف وہ والہانہ انداز میں لپکتے ہیں تا کہ ان کی مضطرب زندگی کو سکون مل سکے:

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لیے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے
کسی بچہ کا جب پہلا سپارہ ختم ہوتا ہے

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آ گئیں
ڈھال بن کے سامنے ماں کی دعائیں آ گئیں

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے
ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

دن بھر کی مشقت سے بدن چور تھا لیکن
ماں نے مجھے دیکھا تو تھکن بھول گئی ہے

ماں کی مامتا کا یہ جذبہ جو بچے کو دنیا کے سرد گرم سے بچا لیتا ہے جس تکرار و توارد کے ساتھ منور رانا کی غزلوں میں ابھرا ہے شاید اردو کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ منور رانا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مامتا کی روشنی سے اپنی غزلوں کے نگار خانے کو منور اور مستنیر کیا ہے۔

کسی زمانے میں دلّی اور لکھنؤ کے مفروضہ دبستانوں سے الگ ہٹ کر اکبر آباد نے اپنی شاعری کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ ہمارے عہد میں نظیر کی طرح پیش پا افتادہ موضوعات کو اپنے قلم سے امر کر دینے کا فن منور رانا کو خاطر خواہ معلوم ہے۔ وہ خیالات کے نہیں بلکہ واقعات و حادثات کے شاعر ہیں۔ وہ واقعات و حادثات جو سماجی اور اقتصادی ناہمواریوں کے پروردہ ہیں۔ غربت، افلاس، تلاش معاش، شہری اور دیہی معاشرت کی ستیزہ کاری، گھر آنگن کی الجھنیں، متوسط گھرانوں کی محرومیاں اور کامرانیاں، ان موضوعات پر جب منور رانا شعر کہتے ہیں تو ان کی آواز اردو شاعری کی ایک منفرد آواز بن جاتی ہے اور ان کا شعری رویہ اپنی شناخت پیدا کر لیتا ہے۔

منور رانا کی کامیابی کا راز ان کے اچھوتے موضوعات کے علاوہ ان کے فنی رویے میں بھی مستور ہے۔ لوگ پرانی شراب کو نئے جاموں میں پیش کرتے ہیں تو انھوں نے اپنی نئی بات کہنے کے لیے پرانے اسالیب کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ دوئم یہ کہ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ ان کا فنی جھکاؤ بنیادی طور پر سہل ممتنع کی طرف ہے لیکن جہاں جہاں انھوں نے عصری مسائل کے اظہار کے لیے پرانی تلمیحات اساطیر

اور دیومالا کا استعمال کیا ہے وہاں انھوں نے روایتی رموز و علائم میں نئی معنویت بھر دی ہے اور اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن کی قدیم بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے بھی جدید تقاضوں اور عصری آگہی کے شاعر ہیں۔

منور رانا کی ادبی عمر ابھی بہت کم ہے اسی لیے ہمارے بزرگ ''شرفائے ادب'' ان پر کچھ لکھنا اپنی مصلحتوں کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ وہ غالب، اور اقبال پر اس لیے لکھتے ہیں کہ ان بقائے دوام پانے والے شعرا کے حوالے سے ان کا نام بھی زندہ ہے۔ نئے اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی ان کے ضابطۂ اخلاق سے خارج ہے۔ ان میں خوداعتمادی اور عرفانِ ذات کی کمی ہے، یہ جاننے کے باوجود کہ ادبی قدر و قیمت کا تعین عوام نہیں کرتے۔ وہ ان شعرا سے اور بھی زیادہ جلتے ہیں جو مشاعروں کی عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے بعد شہر ادب میں داخل ہو رہے ہیں۔ منور رانا چوں کہ مشاعروں کے مقبول ترین شاعر ہیں اس لیے ان کے سلسلہ میں تنقید کی بے التفاتی کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ماہنامہ سہیل (گیا) مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اپنا ایک خصوصی نمبر منور رانا کے نام سے معنون و منسوب کیا ہے۔ وہ ایک نئی آواز کے ساتھ ہمارے ادب میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ نہ تو انقلاب کے ڈھنڈورچی ہیں اور نہ مطرب بزم دلبراں بلکہ وہ ہمارے گھر آنگن کے شاعر ہیں۔ یہ آنگن گاؤں کا بھی ہے اور صنعتی شہروں کا بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب تک یہ گاؤں کا ہے اس میں ماؤں کی شفیق آغوش اور بہنوں کے پیار بھرے آنچل لہرایا کرتے ہیں مگر جب یہ معاشی ضروریات کے تحت شہر کا آنگن بنتا ہے تو پھر قدروں کی شکست و ریخت میں انسانی اخبارات سے کاٹی ہوئی تصویر بن جاتا ہے جس کو کاغذ چننے والے اس کے تمام تر تہذیبی اثاثہ کے ساتھ دوسرے دن اٹھا لے جاتے ہیں اور معیشت اور رزق کے بازار میں اتنی کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں جس میں بچوں کا غبارہ بھی نہیں خرید ا جا سکتا۔

○■○

فراق گورکھپوری: گہے ایزدو گہے اہرمن

منہ سے ہم اپنے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
ہے ترا دوست مگر آدمی اچھا بھی نہیں
(فراقؔ گورکھپوری)

گفتگو آگے بڑھی۔

جٹادھاری پنڈت گوری شنکر مصرا اس بات پر مصر تھے کہ ماضی کو حال سے بہتر ثابت کر کے رہیں گے۔ انھوں نے فراقؔ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''جب میرے مکان کی بنیاد کھودی جا رہی تھی تو اس میں سے ایک پرانا زنگ آلودہ تار برآمد ہوا، میں نے اسے ماہرین کو دکھایا۔ انھوں نے اس بات کی تائید کی کہ یہ تار ہزاروں سال پرانا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے زمانہ میں بھی ہندوستان کے اندر بجلی موجود تھی۔''

فراقؔ صاحب آرام کرسی پر سیدھے بیٹھ گئے۔ سگریٹ کا ایک کش کھینچتے ہوئے آنکھیں نچا کو بولے:

''پنڈت جی آپ نے تکلف سے کام لیا ہے جب میرا مکان کھودا جا رہا تھا تو اس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں Wireless بھی موجود تھا۔''

پنڈت جی اپنی تمام تر طلاقتِ لسانی کے باوجود کھسیا کر رہ گئے اور تمام محفل قہقہہ زار میں تبدیل ہوگئی۔

یہ ۴۹-۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ گورکھپور کی ادبی فضا کافی متحرک اور فعال تھی۔ نواب زادہ علی کبیر کا ''نشیمن'' نکل کر بند ہو چکا تھا۔ مگر اس کے پرانے پرچے دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ مولانا خیر بہوروی کی سرپستی میں عزیز مسعودی ماہنامہ ''بھائی'' کا اجرا کر چکے تھے۔ شاگردِ داغ دہلوی مولوی عمر گورکھپوری ابھی زندہ تھے اور مقامی شعری نشستوں میں مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ حکیم امجد حسین نظر ریتی چوک اور نخاس کے درمیان اپنے اونچے مطب میں بوتلوں کی قطاریں الماریوں میں سجائے ہوئے ہر گزرنے والے کو اپنی زیارت سے فیض یاب کرتے تھے۔ غلام مرتضٰی جگر اور ایشوری پرشاد گہر کی رندی اور سرمستی کی بازگشت ادبی حلقوں میں سنائی دیتی تھی۔ پستہ قد ہندی گورکھپوری غیر مقامی مشاعروں میں مدعو کئے جانے کے باعث اپنے ہم عمروں میں سربلند نظر آتے تھے۔ مسلم، شبنم، احمر، رؤف، شرر، نامی، رشیدی، ساحر، سرمد، کرشن مراری، ناظر الشاکری، شمیم مظفر پوری، اختر، نور، شمس الآفاق، عمر، عبدالحی، ماسٹر احمد اللہ، گردش، غبار اور نہ جانے کتنے اور نئے اور پرانے چراغوں سے گورکھپور کا نگارخانۂ ادب جگمگا رہا تھا۔ کم و بیش یہی وہ زمانہ تھا جب دور حاضر میں جدیدیت کی شیرازہ بندی کرنے والے شمس الرحمٰن فاروقی نے جماعت اسلامی کی ادبی تنظیم تعمیر پسند مصنفین کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے سکریٹری کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا تھا مگر اس وقت ہماری نیک نامیوں اور رسوائیوں کا دائرہ گورکھپور کے ضلعی جغرافیہ تک محدود تھا۔ البتہ ایک شخصیت ایسی تھی جس کے سامنے گورکھپور کے شعرا و ادبا تو درکنار، اردو کے مشاہیر آکر سرِ تسلیم خم کرتے تھے اور یہ شخصیت تھی جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی۔

مجنوں صاحب اس وقت سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں انگریزی اور اردو ادبیات کے استاد تھے اور میاں صاحب کے مشہور امام باڑے کے مشرقی حصے میں

رہائش پذیر تھے۔ ان کے لیے دیئے رہنے کا انداز، ان کا علمی وقار اور ان کی زندگی کے ضابطے کچھ اتنے سخت تھے کہ بغیر اذنِ باریابی کے بڑے بڑوں کی ہمت ان کی صحبت میں بیٹھنے کی نہیں پڑتی تھی۔ میں ان کے چند خوش نصیب شاگردوں میں ایک تھا جو کلاس روم کے علاوہ بھی ان کے مکان پر جا کر شاگردانہ نیاز مندی کے ساتھ ان سے اکتساب فیض کرسکتا تھا۔ انھیں کے مکان پر سب سے پہلی بار مجھے فراقؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ ان کو میں پہلے بھی مشاعروں میں دیکھ چکا تھا اور ان کے پڑھنے کے انداز، ان کے کلام، ان کی سگریٹ پینے کی مخصوص ادا، ان کی ناچتی ہوئی آنکھوں کی چمک سے متاثر بھی ہوا تھا۔ مگر وہ مشاہدہ جو مطالعہ بھی ہوتا ہے اس کا آغاز مجنوںؔ صاحب کے مکان ہی سے ہوا جہاں کبھی کبھی فراقؔ آکر مہمان ہوا کرتے تھے۔

فراقؔ صاحب مجنوںؔ کے مہمان ہوتے تھے تو علم و ادب کا وہ سنجیدہ وقار اور دبدبہ جو مجنوںؔ کی شخصیت کے ساتھ لازم و ملزوم تھا پگھل کر لطیف ہوجایا کرتا تھا اور علمی اور ادبی رموز و نکات بحث و مباحثہ اور لطیفوں کا سہارا لے کر فروغ پاتے تھے۔ مجنوںؔ ان کو رگھوپتی کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور فراقؔ ان سے اس دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے جس بے تکلفی کی اجازت مجنوںؔ نے شاید اپنے معاصرین میں کسی کو دی ہو۔ طالب علمی کے انھیں سنہرے دنوں اور چمکتی راتوں کا واقعہ ہے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ فراقؔ، مجنوںؔ کے مہمان ہیں اور شام کو ریلوے کالونی یا ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں ان کی آمد پر مقامی شعراء کی ایک اعزازی نشست ہے۔ میں اس زمانے میں نہ تو شاعری کرتا تھا اور نہ مشاعروں میں شعراء کے تعارف کے فرائض انجام دیتا تھا لیکن فراقؔ صاحب کو سننے کی کوشش اور اس بات کے امکانات کے پیشِ نظر کہ شاید مجنوںؔ صاحب بھی اپنا کلام سنائیں، میں اپنے چند ہم جماعت دوستوں کے ساتھ برسات کی اس شام کو جب پانی ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہا تھا بھیگتا بھاگتا انسٹی ٹیوٹ پہنچ گیا اور پچھلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ ڈائس کے پیچھے ہی انسٹی ٹیوٹ کا شراب خانہ تھا، فراقؔ صاحب کافی بدمست تھے اور مجنوںؔ صاحب بھی وہ نہیں تھے جو ہوا کرتے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا، چند شعرا

کے بعد فراق نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ چند متفرق اشعار کچھ رباعیاں، کچھ لطیفے اور کئی غزلوں سے انھوں نے سامعین کو نوازا اور پھر یکایک بولے ''اب مجنوں اپنا کلام سنائے گا۔'' مجنوں صاحب کھڑے ہوئے، ازار بند شیروانی سے نیچے گھٹنوں تک لٹک رہا تھا، آواز متاثر تھی۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں بولے ''حضرات میں تو نثر کے ہتھوڑے چلانا جانتا ہوں لیکن رگھوپتی کہتا ہے کہ میں اپنے اشعار سناؤں، اس کی بات ٹالی بھی نہیں جاتی، چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔ وہ پہلا دن تھا جب میں نے مجنوں صاحب کا کلام ان کی زبان سے سنا اور انھیں شراب کے نشے میں بدمست و سرشار دیکھا۔ مجنوں جنھیں گورکھپور کے بازاروں نے کبھی خرید و فروخت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جن کی وضع داری نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا کہ تانگے یا جیپ کے علاوہ کبھی پیدل یا رکشہ پر کالج آئیں۔ جو گھر کے باہر شیروانی چوڑی دار پائجامہ اور وارنش کے چمکدار جوتے کے علاوہ کسی اور لباس میں کبھی نہ دیکھے گئے جن کی چھٹانک بھر کی جسامت کے آگے بقول شوکت تھانوی، ادبی پہاڑوں پر رعشۂ سیماب ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ جب گورکھپور کی اس شام کو پہلی بار اس عالم میں نظر آئے تو اس وقت ہمارا طالب علمانہ تصور اس نتیجہ پر پہنچا۔ جب فراق آتے ہیں تو مجنوں خراب ہوجاتے ہیں۔

وقت گزرتا جارہا تھا میں تاریخ اور انگریزی میں ایم۔ اے کر کے شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے شعبہ ادبیات انگریزی میں لکچرر ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد سے نکلنے والا رسالہ ''نکہت'' شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل کو پروان چڑھا رہا تھا۔ تیغ الہ آبادی (جو بعد میں مصطفیٰ زیدی ہوئے) اسرار ناروی (جو بعد میں ابن صفی ہوئے) راہی معصوم رضا جنھوں نے شکیل اختر کے نام سے لکھا، نازش پرتاب گڑھی، شکیل جمالی، ابن سعید (ڈاکٹر مجاور حسین رضوی) نافع رضوی، سلام مچھلی شہری، ذکی انور، سب کے سب ''نکہت'' کے مدیر اعلیٰ عباس حسینی کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ ''نکہت کلب'' کے عنوان سے اس رسالہ میں قلمی دوستی کا ایک بہت ہی متحرک اور فعال گوشہ بھی تھا جس کی شاخیں مختلف شہروں میں موجود تھیں۔ چونکہ میرے درجنوں

افسانے اس رسائل میں شائع ہو چکے تھے اور ایک فرضی نام سے میں اس کا قلمی حصہ بھی کافی عرصہ سے لکھ رہا تھا، اس لیے میں ''نکہت کلب'' کی کل ہند تنظیم کا صدر منتخب کرلیا گیا اور میں نے اس کی سالانہ کانفرنس کا انعقاد جس میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی شامل تھا اعظم گڑھ میں کرڈالا۔ یہ ۱۹۵۳ کی بات ہے۔

مشاعرہ میں نوحؔ ناروی، جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، شفیقؔ جونپوری اور عارفؔ عباسی سے لے کر فناؔ نظامی اور شمسیؔ مینائی تک کم و بیش تیس پینتیس شعراء نے شرکت کی۔ جگر صاحب اپنے دیرینہ کرم فرما مرزا احسان صاحب کے ساتھ قیام پذیر ہوئے اور فراقؔ صاحب کو محلّہ تکیہ کے ایک مکان کے بالائی حصہ میں مسعود اختر جمال کے ساتھ ٹھہرا دیا گیا۔ وہ عباس حسینی کی موٹر پر الہ آباد سے ان کے ہمراہ آئے تھے اور صبح ہی کو اعظم گڑھ پہنچ گئے تھے۔ فراقؔ صاحب اور مسعود اختر جمال نے خوب شراب پی۔ شکم سیر ہوکر دن کا کھانا کھایا اور سو گئے۔ میں انتظامی امور سے فارغ ہوکر جب سہ پہر کی چائے کے لیے فراقؔ صاحب کے پاس پہنچا تو وہ بیدار ہو چکے تھے، مجھے دیکھتے ہی غصہ سے بولے ''مشاعرہ کرنے کا بڑا شوق ہے لیکن شعرا کی ضیافت کا بوتا نہیں ہے، کھانے میں بھینسے تک کا بھی گوشت میسر نہیں۔'' میں نے معذرت چاہی اور ان کو یہ بتلایا کہ اعظم گڑھ میں ایک دن ذبیحہ نہیں ہوتا، بدقسمتی سے آج وہی دن تھا۔ مگر فراقؔ صاحب نے سنی ان سنی کردی۔ کہنے لگے، ٹھہرنے کا بھی انتظام خوب کیا ہے، دن بھر سو نہیں سکا، اور سوتا بھی کیسے۔ سر پر بسم اللہ خان کی روشن چوکی جو بج رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے مسعود اختر جمال کی طرف اشارہ کیا، جو بے خبر سو رہے تھے اور بلند آواز کے ساتھ خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے ان کے غصہ کو نیازمندانہ عقیدت کے ساتھ برداشت کیا اور جب وہ چائے پی چکے وہاں سے رخصت ہوگیا۔

غروبِ آفتاب کے وقت فراقؔ نے طلوعِ جام کیا اور پھر قیام گاہ سے لے کر مشاعرہ گاہ (ہری اودھ کلا بھون) تک کا سفر قیامت ہوگیا۔

وہ بڑی منت سماجت کے بعد کالج کے استاد وسیم الحسن صاحب کی مدد سے رکشہ

پر لاد دیئے گئے۔ سگریٹ شیروانی کی جیب میں تھی اور شیروانی کی جیب ان کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ بہزار دقت وہ نکالی گئی دیا سلائی دوسری جیب میں تھی، وہ برآمد کی گئی۔ کئی تیلیاں جلانے کے بعد کسی طرح سگریٹ جلی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اپنا ایک شعر ترنم کے ساتھ گنگنانے لگے۔ ترنم بھی ایسا تھا جیسے بڑے بوڑھے صبح کے وقت مناجات پڑھ رہے ہوں۔ ابھی رکشہ ڈسٹرکٹ جیل کے پاس ہی پہنچا تھا کہ ان کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی، رکشہ تو رُک گیا مگر ازار بند نہ کھل سکا اس میں گرہ پڑ گئی تھی۔ پائجامہ اٹھا کر ان کو پیشاب کروایا گیا اور پھر وہ اپنی بیوی کی شان میں رطب اللسان ہوگئے۔ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں انھوں نے موصوفہ کو کئی گورکھپوری گالیوں سے نوازا اور یہ انکشاف کیا کہ وہ ہمیشہ ازار بند کے بجائے پائجامہ میں ساری کا کنارا ڈال دیتی ہیں۔ نتیجہ میں گرہ پڑ جاتی ہے اور ان کو انھیں مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن سے ابھی وہ گزر چکے ہیں۔ مشاعرہ گاہ کے دروازے پر ایک اور سانحہ ہوگیا۔ وہ ابھی داخل ہی ہو رہے تھے کہ دوسرے دروازے سے جگر صاحب آگئے۔ اعظم گڑھ کے لوگوں نے جگر صاحب کی رندی اور سرمستی کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد تالیفِ قلب کے ساتھ اس شہر میں پہلی بار آئے تھے۔ اس لیے لوگوں کی توجہ انھیں کی جانب مرکوز ہوگئی۔ مجمع میں ایک شور اٹھا "جگر صاحب آگئے، جگر صاحب آگئے۔" یہ سننا تھا کہ فراق بدک گئے اور بولے کہ "جب جگر آگئے تو پھر میری کیا ضرورت۔" اور ڈائس پر بیٹھے بغیر واپس جانے لگے۔ میں اپنی اور اراکین کی اس منت سماجت کو احاطۂ تحریر میں نہیں لاسکتا جس سے مجبور ہوکر فراق مشاعرہ کی شرکت پر آمادہ ہوئے۔

نکہت کلب کا یہ مشاعرہ میری زندگی اور اعظم گڑھ کے مشاعروں کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مشاعرہ سے قبل میں نکہت کلب ہی کے ایک مشاعرہ میں جو دانا پور (پٹنہ) میں منعقد ہوا تھا شعرا کا تعارف کرا چکا تھا مگر اس مشاعرہ کے بعد اعظم گڑھ میں ایک بار پھر مشاعروں کا چلن ہوگیا اور وہاں کے قصبات اور گاؤں تک میں مشاعروں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں باضابطہ طور

پر ابتدائی کچھ برسوں تک مشرقی اضلاع اور پھر پورے ہندوستان میں اسٹیج سکریٹری کے فرائض ادا کرنے کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔ اس وقت سے لے کر فراقؔ صاحب کے انتقال تک یعنی کم و بیش اس تیس سال کے عرصہ میں ان سے میرا سابقہ صدہا مشاعروں میں پڑا۔ مگر اپنے دل کی بات آپ سے کہتا ہوں کہ میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس اہم بات پر ناخوش اور کس معمولی بات پر خوش ہو جائیں گے۔ کبھی میں نے ان کا مصرعہ اٹھایا اور انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ کبھی خاموش رہا تو بولے ''مصرعہ اٹھاؤ۔'' وہ جب تک اسٹیج پر موجود رہتے ہیں ڈرا اور سہا رہتا کہ نہ جانے کب وہ کسی کی عزت و آبرو نیلام کر دیں۔ پٹنہ میں علامہ جمیل مظہری کا جشن ہو رہا ہے۔ اردو کے مشاہیر شعرا موجود ہیں صدارت بہار کے گورنر مسٹر ڈی۔ کے بروا کر رہے ہیں۔ وہ اپنی افتتاحی تقریر میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ انھیں آج فراقؔ کو اپنا ذاتی مہمان بنا کر جتنی خوشی حاصل ہوئی ہے اتنی خوشی اس روز بھی نہیں ہوئی تھی جب انھیں گورنر نامزد کیا گیا تھا۔ مشاعرہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے، نومشق اور مبتدی شعرا اپنا کلام سنا رہے ہیں کہ یکا یک فراقؔ صاحب نے منہ بنایا، آنکھیں نچائیں اور مجھے حکم دیا کہ میں انھیں دعوت سخن دوں۔ مجھ میں یہ ہمت کہاں تھی کہ میں ان کے حکم کی تعمیل نہ کرتا۔ تفصیلی تعارف کے بعد ان سے کلام سنانے کی گزارش کی، فراقؔ صاحب مائک کے سامنے آئے، جی نہیں بلکہ مائک ان کے سامنے لایا گیا، منہ میں سگریٹ، لگائی، میں نے ماچس جلائی۔ دو ایک کش لیے، لطیفے سنائے، متفرق اشعار سے نوازا، غزل پیش کی، چلتے چلاتے دو چار رباعیاں بھی سنا ڈالیں۔ جب سب کچھ کر چکے تو بولے ''حضرات آپ نے اردو کے سب سے بڑے شاعر کا کلام سن لیا۔ اب آپ اپنے گھروں کو تشریف لے جایئے۔'' سب حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے سامعین سے کہا ''فراقؔ صاحب مذاق کر رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں ابھی بہت سے شعرا کو اپنا کلام سنانا ہے۔' فراقؔ صاحب بولے'' آپ کا جو جی چاہے کریں مگر میں یہ بتا دیتا ہوں کہ جو قوم گیارہ بجے رات کے بعد شعرا کے اشعار سنے گی وہ ترقی نہیں کر سکتی۔'' یہ کہتے ہوئے اپنی چھڑی سنبھالی، دو ایک بار منہ بنایا

اور ڈائس سے اتر کر قیام گاہ کی طرف چلے گئے۔ فراق صاحب اگلے لمحے کیا کر ڈالیں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

شبلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ فراق صاحب حسبِ معمول اپنے انفرادی اور امتیازی انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں، شعراء کا کلام بڑی بے توجہی کے ساتھ سن رہے ہیں، کبھی منہ بناتے ہیں، کبھی خلا میں گھورتے ہیں، کسی کسی شعر پر آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور جب ان کی باری آتی ہے تو کلام سنانے کے بجائے پہلے تو ہندی والوں کی خبر لیتے ہیں اور بڑے ہی جذبات کو ٹھیس پہنچانے والے انداز میں ہندی پر اردو کی سبقت اور برتری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ''تم پہلے کے بجائے ''پرتھم'' کہو گے تو میں تھوک دوں گا، دوسرے کے بجائے ''دوتیہ'' بولو گے تو میں قے کر دوں گا'' وغیرہ وغیرہ، ہندی کے طلبا اور اساتذہ میں بے چینی پیدا ہوتی ہے، ہنگامہ ہونے والا ہی تھا کہ نہ جانے کیسے روئے سخن علامہ اقبال کی طرف ہو گیا، نتیجہ ظاہر تھا۔ ہندی کے طرفدار اور اقبال کے پرستار دونوں ان سے ناخوش ہو گئے اور وہ پھر کبھی شبلی کالج یا اس سے متعلقہ اداروں میں مدعو نہیں کئے گئے۔

حلیم ڈگری کالج کانپور کے مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لیے فراق صاحب تشریف لائے ہیں۔ پرنسپل رضوی نے ان کے ٹھہرنے کا خصوصی انتظام اپنے آفس میں کیا ہے۔ سجے سجائے کمرے کو چار پائی اور آرام دہ بستر ڈال کر عارضی طور پر بیڈ روم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میں فراق صاحب کے پاس بیٹھا ہوا ہوں، مگر فراق صاحب مضطرب اور بے چین ہیں۔ بار بار دیوار پر آویزاں رضوی صاحب کی تصویروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں رضوی صاحب تشریف لاتے ہیں ''فراق صاحب کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' ''جی نہیں تشریف رکھئے۔'' رضوی صاحب ایک کرسی پر تابعدارانہ انداز میں بیٹھ جاتے ہیں ''کیوں جناب یہ سب تصویریں آپ کی ہیں'' فراق صاحب دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھتے ہیں، رضوی صاحب شرماتے ہوئے ''جی ہاں'' کہہ کر اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ فراق صاحب کا لہجہ کرخت اور چہرہ تبدیل

ہوجاتا ہے، ''تصویریں کھنچوانے کا بڑا شوق ہے مگر منہ تو آپ کا چقندر جیسا ہے۔ کس احمق نے آپ کو پرنسپل بنا دیا ہے، یہ میرے ٹھہرنے کا انتظام آپ نے کیا ہے۔ میں اپنی شیروانی کہاں ٹانگوں گا، بوتل کہاں رکھوں گا اور کرسیاں۔ یہ کرسیاں، جب مجھے کسی کی توہین کرنی ہوتی ہے تو اپنے گھر پر اس طرح کی کرسیوں پر اسے بٹھاتا ہوں..... '' وغیرہ وغیرہ۔ رضوی صاحب ہنستے ہوئے سب باتوں کو جھیل جاتے ہیں اور ایک رضوی صاحب کیا، نہ جانے ان کے معاصرین میں کن کن لوگوں کو ان منزلوں سے گزرنا پڑا ہے اور سب نے یہ سوچ کر برداشت کیا ہے کہ یہ اندازِ تکلم رگھوپتی سہائے کا نہیں بلکہ فراقؔ گورکھپوری کا ہے جو ایک عظیم شاعر ہے۔

گورکھپور کے بابو پرمیشوری دیال مختار کے ڈرائنگ روم میں فراقؔ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، میں اور میرے ہمراہ اور کئی ایک شعرا ان کے حاشیہ نشینوں میں ہیں۔ فراقؔ صاحب لطیفے پر لطیفہ سنا رہے ہیں، پوری محفل قہقہہ زار بنی ہوئی ہے، کہ یکا یک ڈرائنگ روم کے پردے میں جنبش ہوتی ہے اور آنند موہن گلزارؔ زتشی پارے کی طرح سے اُچھلتے ہوئے ''اخاہ فراقؔ صاحب'' کہہ کر ان سے بغل گیر ہوجاتے ہیں۔ کمرے میں زلزلہ آجاتا ہے، فراقؔ صاحب گرجنے لگتے ہیں'' آپ اپنی اس حرکت سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ فراقؔ جیسے عظیم شاعر سے آپ اس حد تک بے تکلف ہیں۔ اگر میرؔ ہوتے غالبؔ ہوتے تو کیا اسی انداز میں آپ ان سے ملتے'' وغیرہ وغیرہ۔ پوری محفل پر سناٹا چھا جاتا ہے اور ہم سب دم بخود ہوکر راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔

نفسیاتی وجہ چاہے جو کچھ بھی رہی ہو، مگر میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ایک اچانک پن کے ساتھ دوسروں کی توہین کی حد تک مذاق اڑا کر فراقؔ صاحب اپنی ''انا'' اور انفرادیت کے امتیازی پہلو پیدا کرلیا کرتے تھے۔ بزم شنکر و شاد دہلی کا انڈو پاک مشاعرہ ہے، کوئی شاعر اپنا کلام پڑھ رہا ہے، فراقؔ صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ''کون صاحب ہیں'' یہ گفتگو شاعر بھی سن لیتا ہے۔ وہ بڑی عقیدت کے ساتھ احترام آمیز انداز میں کہتا ہے ''فراقؔ صاحب آپ مجھے بھول گئے۔ ابھی کچھ دنوں قبل میں فلاں فلاں جگہوں پر

آپ کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا ہوں۔ فراقؔ صاحب کی ذہانت فوراً ایک لطیفہ گڑھ لیتی ہے۔ شاعر اپنے مائکروفون پر کھڑا ہے اور فراقؔ صاحب میرا مائکروفون استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''انگلستان کا مشہور ایکٹر (نام مجھے یاد نہیں ہے) جو ہملیٹ کا پارٹ ادا کرتا تھا، ایک دن ہوا خوری کے لیے سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک صاحب آئے اور بڑے ہی تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ایکٹر نے پوچھا آپ کون صاحب ہیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ صاحب بولے ''تعجب ہے، میں آپ کا رفیق کار اور ساتھی ہوں۔ روزانہ رات میں آپ کے ساتھ ڈرامے میں پارٹ کرتا ہوں اور آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔'' ایکٹر نے پوچھا ''کون سا پارٹ کرتے ہیں، مجھے یاد نہیں۔'' ان صاحب نے کہا کہ ڈرامے میں جب صبح کا منظر پیش کیا جاتا ہے تو میں پردے کے پیچھے سے مرغے کی بولی بولتا ہوں۔'' لیجیے سامعین پر قہقہوں کا دورہ پڑ گیا اور اس شاعر کی عاقبت خراب ہوگئی۔

فراقؔ صاحب مشاعروں میں عموماً اس وقت آتے تھے جب مشاعرہ شروع ہو چکا ہوتا اور ان کی آمد اس شاعر کے لیے جو اس وقت اپنا کلام سنا رہا ہے موت کا پیغام ہوتی تھی (مشاعرہ کے نقطۂ نگاہ سے)۔ فراقؔ صاحب اسٹیج پر آتے ہی اس انداز میں تھے کہ سامعین کی توجہ شاعر سے ہٹ کر ان پر مرکوز ہو جاتی تھی۔ ان کی حرکات وسکنات، ان کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ ان کی شخصیت، ان کی وضع قطع اور کبھی کبھی ان کا لباس (میں نے گورکھپور کے ایک مشاعرہ میں ان کو سفید ساٹن کا چمکدار پائجامہ پہنے ہوئے دیکھا ہے)۔ یہ تمام چیزیں مل کر ایک مقناطیسی کشش پیدا کرتی تھیں اور لوگ انھیں دیکھنے لگتے تھے۔ دہلی کے انڈو پاک مشاعرے میں نازشؔ پرتاپ گڑھی اپنی نظم ''متاعِ قلم'' سنا رہے ہیں۔ نظم ابھی اپنے ابتدائی مراحل ہی میں ہے کہ فراقؔ صاحب کی آمد آمد کا غلغلہ اٹھا۔ نازشؔ رک گئے جب حالات پرسکون ہوئے تو نازشؔ نے پھر سے اپنی نظم کو آگے بڑھایا۔
جب وہ اس مصرع پر پہنچے:

قلم خریدنے اٹھے ہیں اہلِ دولت بھی

تو فراقؔ صاحب نے گردن اٹھا کر اور آنکھیں نچا کر پوچھا ''بھئی یہ اہلِ دولت قلم کیسے خریدتے ہیں؟'' نازشؔ جھلاّ تو پہلے ہی گئے تھے، اس سوال پر سامعین کے قہقہوں نے ایک اور تازیانہ لگایا، اپنی تمام تر سلامت روی کو بالائے طاق رکھ کر بولے ''گیان پیٹھ کا ایک لاکھ کا انعام دے کر۔'' فراقؔ کو اسی سال گیان پیٹھ کا انعام ملا تھا۔ جواب چاہے صحیح رہا ہو یا نہ رہا ہو مگر اتنا برجستہ اور بھرپور تھا، کہ فراقؔ کی ذہانت منہ دیکھتی رہ گئی۔

فحش لطیفے سنانا، مشاعرے میں کسی شاعر کی توہین کر دینا، جھگڑا کر لینا فراقؔ صاحب کے معمولات میں شامل تھا۔ گورکھپور کے ایک مشاعرے میں انھوں نے شمسؔ مینائی کو مرغی کا بچہ کہا۔ فضل بھائی داؤد ٹرسٹ کے مشاعرے میں انھوں نے ظ۔ انصاری کو بلا کسی وجہ کے برا بھلا کہا، جشن وسیمؔ کے موقع پر بریلی میں وہ ناظرؔ خیامی سے بھڑ گئے اور ان لوگوں کی فہرست تو کافی طویل ہے جو فراقؔ صاحب کے جارحانہ جملوں کو محض اس لیے پی گئے کہ وہ بزرگ ہی نہیں بلکہ ایک بڑے شاعر بھی ہیں۔ جب جگرؔ صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی، تو شعبۂ اردو گورکھپور کے اساتذہ نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ (یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد) فراقؔ صاحب کا براہِ راست تعارف یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مجلس منتظمہ کے اراکین سے ہو جائے اور پھر بعد میں اعزازی ڈاکٹریٹ والے مسئلہ کو آگے بڑھایا جائے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس تقریب کا غیر معمولی اہتمام کیا اور وائس چانسلر کے ساتھ ساتھ شہر کے سبھی معززین اور اکابرین کو مدعو کیا۔ اس موقع پر ایک خصوصی بروشر بھی شائع ہوا۔ فراقؔ صاحب اس تقریب میں آئے اور بڑی آن بان سے آئے، جلسہ شروع ہوا، یکا یک بروشر پر شائع شدہ اپنے ایک شعر پر ان کی نگاہ پڑ گئی، جو کاتب کے خامہ اصلاح کے ضربات شدیدہ سے غلط شائع ہو گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اردو کتابت کی تاریخ میں غیر معمولی رہی ہو، مگر فراقؔ صاحب نے اس بھرے مجمع میں جس طرح شعبۂ اردو کے اساتذہ اور تقریب کے اراکین کی عزت و آبرو لوٹی، شاید اس کی کوئی مثال اردو تقریبات کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب

کے حوصلے پست ہو گئے اور اعزازی ڈگری والا مسئلہ اپنی جگہ پر رہ گیا۔ فراقؔ صاحب نادان کے ہاتھ کے تلوار تھے، اس سے کب کسی دوست یا دشمن کا گلا کٹ جائے گا اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔

فراقؔ صاحب اگر رگھوپتی سہائے نہ ہوتے تو ان کے بہت سے جملے فسادات کا موجب بن جاتے، سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور کے ایک ادبی جلسہ میں انھوں نے ایک بہت ہی اہم مذہبی شخص کو Intercultural Interloper کہا۔ حلیم ڈگری کالج کانپور کے مشاعرے میں تقریر کرتے ہوئے جب وہ عہد حاضر کی برکتوں کا ذکر کرنے لگے تو انھوں نے یک دوسری مذہبی شخصیت کے بارے میں کہا کہ اگر وہ موجودہ دور میں ہوتے تو انجن کی سیٹی سن کر ان کی دھوتی خراب ہو جاتی۔ اردو کے مسئلہ پر شاید ہی ان کی کوئی ایسی تقریر رہی ہو جس میں انھوں نے اردو کے موقف کو مثبت انداز میں پیش کیا ہو، وہ ہمیشہ اردو کا تقابلی موازنہ ملک کی سرکاری زبان ہندی سے کرتے تھے اور بڑے ہی جارحانہ طریقے سے ہندی کے منفی پہلوؤں کو استہزائی انداز بیان کے ساتھ پیش کرتے تھے اور اس کے اہم شعرا اور ادبا کا مذاق اڑاتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے فکر انگیز اور بلیغ جملوں کو بھی لوگ تفریحی انداز میں سنتے تھے اور جب ان کا پارہ کچھ نیچے گرنے لگتا تھا تو پھر کوئی نہ کوئی انھیں چھیڑ دیتا تھا اور وہ مزید جوش و خروش کے ساتھ تبرا پڑھنے لگتے تھے۔

یہ سب تو اس کھرے سکہ کا ایک رخ تھا جس پر فراقؔ کی تصویر بنی ہوئی تھی، مگر سکہ کا دوسرا رخ جس پر قیمت لکھی ہوتی ہے، اتنا بیش عیار تھا کہ مملکتِ لوح و قلم کی آنے والی صدیاں اس سکّہ کو سکّۂ رائج الوقت تصور کریں گی۔ گنگا کی سطح پر خس و خاشاک کا انبار اور طرح طرح کی آلودگیاں بھی تیرتی رہتی ہیں مگر ہندوستان صدیوں سے اس کی تقدیس کی قسم کھاتا چلا آ رہا ہے۔ انھیں پراگندہ مظاہر منتشر اور بکھری ہوئی نفسیات کے پیچھے ایک اور بھی چہرہ ابھرتا ہے اور یہ چہرہ اس فراقؔ کا ہے جو ایک عظیم شاعر، مفکر، دانشور اور زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں کا مبلغ بھی ہے جس نے نہ جانے کتنے تضادات

کو اپنی شخصیت کے اندر ہم آہنگ کر رکھا ہے، جو بقول جوش ملیح آبادی ''آسمان خوش لہجگی کا بدر، انجمن آگہی کا صدر، اولیائے ذہانت کا قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کا تاجدار، جودت پناہ، نقاد نگاہ، مہبط جبرئیل اور شاعر بزرگ و جلیل بھی ہے جو مسائل علم و ادب پر جب زبان کھولتا ہے تو لفظ و معنی کے لاکھوں موتی رول دیتا ہے اور اس افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔'' مئوناتھ بھنجن میں کمیونسٹ پارٹی کا اجلاس اور ترقی پسند ادبا کا اجتماع ہے، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری کے علاوہ اس وقت کے سبھی ممتاز شعرا، ناقدین اور افسانہ نگار جمع ہیں۔ شب میں مشاعرہ ہونے والا ہے۔ دن میں مختلف ادبی موضوعات پر اکابرین کی تقریریں ہو رہی ہیں۔ فراق صاحب کو ترقی پسند تحریک کے پس منظر میں اردو غزل کا جائزہ لینا ہے۔ میں فراق صاحب کو جلسہ گاہ کی طرف لے جا رہا ہوں، راستہ میں میں ان سے رازدارانہ انداز میں کہتا ہوں ''فراق صاحب لوگ آپ کو محض شاعر سمجھتے ہیں، آج ایسی تقریر ہو جائے کہ آپ کی دانشوری کا جھنڈا لہرانے لگے۔'' فراق صاحب مسکراتے ہوئے ''اچھا'' کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر فراق صاحب کی تقریر ہوتی ہے، آپ اسے مبالغہ تصور نہ فرمائیں، میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آزادی کے بعد آسمانِ ادب پر جتنے آفتاب و ماہتاب چمکے، میں نے سب کا کلام سنا ہے اور سب کی تقریروں سے استفادہ کیا ہے مگر اس دن فراق صاحب کی تقریر کی کچھ اور ہی بات تھی، انھوں نے جس دلنشیں انداز میں غزل کے گیسوؤں کی مشاطگی کی، اور جس تنقیدی بصیرت ذہن بیدار مغزی کے ساتھ غزل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا وہ فراق صاحب ہی کا حصہ تھا، جس میں کوئی دوسرا مقرر شریک نہیں ہو سکتا۔

میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدہ کے لیے امیدوار ہوں، سہمی ہوئی صلاحیتوں کے ساتھ انٹرویو بورڈ کے سامنے حاضر ہوتا ہوں۔ وائس چانسلر، صدر شعبہ نور الحسن ہاشمی کے علاوہ آل احمد سرور اور فراق گورکھپوری ماہرین زبان و ادب کی حیثیت سے تشریف

فرما ہیں۔ تعلیمی استعداد کے متعلق وائس چانسلر کچھ رسمی سوالات کرتے ہیں، میں سب کے جوابات دیتا ہوں۔ فراقؔ صاحب خاموش بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے ہیں، وائس چانسلر کے بعد سرور صاحب مختلف سوالات کرتے ہیں، میں اپنی بساط کے مطابق انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بات بڑھ کر قرآن کے اردو ترجموں تک آجاتی ہے اور شاہ ولی اللہ کے خانوادے سے شروع ہو کر سرسید کی تفسیر تک پہنچتی ہے۔ یکایک فراقؔ صاحب کی بھاری بھرکم آواز سب پر چھا جاتی ہے ''ہاں بھائی ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمۃ القرآن کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔'' میں ابھی صرف اتنا ہی کہہ پاتا ہوں کہ ''وہ دلّی کے محاوروں کی خاطر آیات کے مفہوم کو توڑ مروڑ دیتے ہیں'' کہ فراقؔ صاحب گفتگو اٹھا لیتے ہیں اور سرور صاحب کو مخاطب کر کے نذیر احمد کو موضوع گفتگو بنا لیتے ہیں، چلئے مجھے نجات مل گئی اور انٹرویو تمام ہو گیا۔ بعد کی ملاقاتوں میں جب کبھی میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتا اور اس بات کا اعتراف کرتا کہ میرا موجودہ منصب آپ کی نوازشات کا نتیجہ ہے تو فراقؔ صاحب کو جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آجاتی اور ایک مسرت آمیز چمک ان کے چہرے پر بکھر جاتی اور آنکھیں جگمگانے لگتیں۔ دوسروں کی خطائیں ممکن ہے کہ فراقؔ کو یاد رہی ہوں۔ مگر میں بڑے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اپنے احسانات انھیں کبھی یاد نہیں رہے۔

فراقؔ صاحب کو میں نے کبھی کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، مرکزی اور ریاستی امرا، گورنر صاحبان، سفرا، سبھی کی موجودگی میں میرا ان کا مشاعروں میں ساتھ رہا ہے۔ میں نے ایسے مواقع پر دوسرے شعرا کو محتاط طریقۂ آداب نشست و برخاست اختیار کرتے دیکھا ہے جو فطری نہیں تھا۔ صرف فراقؔ صاحب کی تنہا مثال ہے کہ جن کے رویہ میں کبھی بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہی قلندرانہ انداز، پیر پھیلا ہے تو پھیلا ہوا ہے، تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے ہیں، تو لگائے ہوئے ہیں۔ گفتگو کر رہے ہیں تو جاری ہے جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھا ہمیشہ ان کے ساتھ رہا سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور میں ایک آئی۔اے۔ایس افسر کو جو مشاعرہ کی صدارت کر رہا تھا

اور ان کی شعر خوانی کے وقت گفتگو کرنے لگا تھا فراق صاحب نے بہت ہی توہین آمیز طریقہ سے سرعام ڈانٹا اور یہاں تک کہہ گئے کہ اگر تمہارے گھروں کی عورتیں اپنی عزت و آبرو بھی نیلام کردیں تو بھی فراق کا ایک شعر نہیں خرید سکتیں۔ (کہا تو انھوں نے کچھ اور تھا، میں ان جملوں کو دہرا نہیں سکتا، مگر مفہوم یہی تھا)

وقت گزرتا جا رہا تھا اور فراق جسمانی انحطاط کا شکار ہو رہے تھے۔ بزم شنکر و شاد دہلی کے انڈو و پاک مشاعروں میں کلام پڑھنے سے قبل انھوں نے اکثر یہ پیشین گوئی کی کہ یہ ان کا آخری مشاعرہ ہے۔ ایسے مواقع پر میں انھیں یاد دلاتا تھا کہ غالب بھی اسی طرح اپنے بارے میں کہا کرتے تھے مگر وہ پیشین گوئی کے مطابق نہیں مرے۔ میری یہ بات فراق صاحب کو اچھی لگتی تھی۔ ان کی ذہین آنکھوں میں زندگی کے چراغ جھلملانے لگتے تھے۔ بعد میں جب وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہوئے تو کرسی پر اٹھا کر مشاعروں میں لائے جانے لگے۔ رمیش ان کے ساتھ ہوتے اور ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے۔ فراق صاحب مشاعروں میں مدعو ہوتے تو رمیش کو بھی مدعو کرانے کی جدوجہد کرتے جو شوق مرزاپوری کے تخلص کے ساتھ اپنا کلام بھی سناتے۔ فراق صاحب کی بیاض، مجموعہ ہائے کلام، سگریٹ ماچس، یہ تمام چیزیں وہ اپنے ساتھ رکھتے اور بڑے ادب اور احترام کے ساتھ فراق صاحب کو بوقت ضرورت پیش کرتے اور جب فراق صاحب اپنا کوئی شعر بھولتے تو لقمہ بھی دے دیا کرتے، میں نے رمیش کو فراق صاحب کے گھر میں نہیں دیکھا ہے مگر سفر میں وہ جتنا فراق صاحب کی دیکھ بھال کرتے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے۔ شاید اس حد تک فراق صاحب کا کوئی قریب ترین رشتہ دار بھی ان کا خیال نہ رکھتا۔

شرافت، تہذیب اور اخلاق کے مروجہ ضابطوں پر فراق صاحب کو پرکھنا غیر دانشمندانہ بات ہوگی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے ضابطے خود بناتے ہیں، عالمی ادب کے عظیم فنکاروں کی داستانِ حیات پڑھیئے اور دیکھئے کہ ان تمام خصوصیات کو جنھیں لوگوں نے کمزوریوں سے تعبیر کیا، ان میں ان کے وجود کی کتنی غیر معمولی طاقتیں

پوشیدہ تھیں۔ فراقؔ اپنی تمام ناہمواریوں اور تضادات کے باوجود ایک ایسے جوہر قابل ہیں جو بقول جوشؔ "ہندستان کے ماتھے کا ٹیکا اور اردو زبان کی آبرو، اور شاعری کی مانگ کا صندل" کہے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جاندار تخلیقی قوت کے مالک ہیں جو شخصیت کے تمام تضادات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے گوئٹے کے بارے میں کہا ہے کہ "وہ ان تمام گناہوں کا نچوڑ تھا جو ایک نابغہ یا جوہر خلاق میں فطری اور لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔" یہ قول اگر ہندستان میں کسی پر صادق آ سکتا ہے تو بقول مجنوںؔ گورکھپوری وہ صرف رگھوپتی سہائے فراقؔ کی ذات ہے۔

وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

ممکن ہے کہ ''شرفائے ادب'' کے نزدیک یہ حوالہ کچھ کم عیار ہو مگر مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آزادئ وطن کے بعد میری شناخت کا امتیازی پہلو مشاعرہ اور مشاعروں میں شعرا کا تعارف کرانا رہا ہے۔ اس عنوان نے اگر ایک طرف مجھے اس بات کا موقع فراہم کیا کہ میں اپنے عہد کے بیشتر چھوٹے بڑے شعرا و ادبا سے شرفِ ملاقات حاصل کر سکا تو دوسری طرف آسمانِ سیاست اور حکومت کے ان چاند ستاروں سے بھی متعارف ہوا جن کی جنبش قلم سے ملکوں اور قوموں کی تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں۔ سیاسی اکابرین، وزرا، سفرا، امرا، والیانِ ریاست، حکام، صدر جمہوریہ، گورنر صاحبان ممتاز سرمایہ داروں، اور صنعت کاروں کی ایک طویل فہرست ہے جن سے گذشتہ پچیس تیس برسوں میں میرا سابقہ پڑا اور ان کے غیر محتاط لمحات میں ان کے ادبی ذوق، سخن وری اور سخن فہمی کے وہ مظاہر دیکھے جو ان کے منصبی فرائض اور عہدوں کے بوجھ تلے دب کر کراہ رہے تھے۔ شعر و ادب کی محفلوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری نے اس وقت بھی شرکت کی جب کہ وزارت عظمیٰ کا بار ان کے کندھوں پر تھا۔ صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد حفاظتی اقدامات کی پرواہ کئے بغیر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ان کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے شعرا اور سامعین کے درمیان سیکیورٹی والے فاصلہ حائل کردیں۔ ہمارے موجودہ صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ اپنے منصب کی پرواہ کئے بغیر نہ صرف مشاعروں میں تشریف لاتے ہیں بلکہ اردو کے ایک بہت ہی جذباتی وکیل بن کر تقریر بھی کرتے ہیں۔ حافظ محمد ابراہیم، سمپورنانند، جنرل شاہ نواز،

دیوکانت بروا، جیوتی باسو، ہیم وتی نندن بہوگنا، ٹی انجیا، اٹل بہاری باجپئی، جگناتھ مسرا، اکبر علی خاں، شنکر دیال شرما، وجے لکشمی پنڈت، خورشید عالم خاں، ضیاء الرحمٰن انصاری، چندر جیت یادو، ایڈوانی، گوپالا ریڈی، رام نریش یادو، چنا ریڈی، نرائن دت تیواری، وسنت ساٹھے، ٹی این سالوے، بوٹا سنگھ، جگ موہن، ولی، کھرانہ، شیلا کول، محسنہ قدوائی، تارکشوری سنہا، یونس سلیم، ہمارے موجودہ گورنر جناب محمد عثمان عارف نقشبندی اور نہ جانے کتنے اور، ان میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنے ذوق وشوق کی آسودگی کی خاطر مشاعروں کے لیے وقت نہ نکالا ہو، مسز اندرا گاندھی نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی مشاعرہ میں شرکت کی ہو، مگر یہ میری بدقسمتی رہی کہ مشاعرہ میری ان کی ملاقات کا عنوان نہ بن سکا۔

میں نے سب سے پہلے قریب سے انھیں اس دن دیکھا جب انھوں نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ یہ ۲۴ر جنوری ۱۹۶۶ء کی بات ہے، میں جشنِ جمہوریہ کے سلسلہ میں ہونے والے سالانہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو تھا۔ یہ شاید دوسرے دن کی بات ہے کہ مرکزی جمعیۃ العلما ہند کی جانب سے کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی کے لان پر عید ملن کی ایک تقریب تھی۔ اگر میرا حافظہ درست ہے تو یہ پہلا عوامی جلسہ تھا جس میں محترمہ اندرا گاندھی نے بحیثیت وزیر اعظم کے شرکت کی تھی۔ صوفے کے ایک سرے پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور دوسرے سرے پر محترمہ اندرا گاندھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک کم سن لڑکا بیٹھا ہوا تھا جسے مفتی صاحب نے بلا کر بٹھا لیا تھا تاکہ ایک حد فاصل قائم رہے۔ اس موقع پر اپنی استقبالیہ تقریر میں مفتی صاحب نے اندرا جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جب بھی ہم لوگ کسی مسئلہ پر آپ کے والد محترم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنا چاہتے تھے، وہ فوراً ترجیحی طور پر ہم لوگوں کو بلا لیتے تھے اور ہمارے مسائل کو حل کردیتے تھے، امید ہے کہ بحیثیت وزیر اعظم کے آپ اپنے والد کی اس روایت کو قائم رکھیں گی۔ اندرا جی نے اس دن ایک بہت ہی چمکتی ہوئی صاف اور شفاف تقریر کی تھی اور مفتی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جب آپ

مجھ سے نہیں بلکہ وزیرِاعظم یعنی پنڈت نہرو جی سے ملنے آتے تھے تو میں سب سے پہلے آپ کو ان سے ملوا دیا کرتی تھی اور جب آپ مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائیں گے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں آپ سے کیوں نہ ملوں گی۔'' اندرا جی کے اس جملے پر پورا مجمع قہقہہ زار بن گیا تھا۔

صبح و شام کے چکر اور ماہ و سال کی گردش کے ساتھ وقت گزرتا جارہا تھا اور مختلف ادبی تقریبات کے سلسلہ میں دہلی میں میری آمد و رفت کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ سیاست سے ۱۹۵۳ء کے بعد میرا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے باوجود خواہش کے کبھی یہ حوصلہ پیدا نہ ہوا کہ میں ان تمام مراحل سے گزر کر جن سے سیاسی لوگ گزرا کرتے ہیں، اندرا جی سے ملاقات کا کوئی عنوان پیدا کرتا۔ بزم شنکر وشاد کے سالانہ انڈو پاک مشاعروں کے بعد پنڈت نہرو کبھی کبھی کچھ منتخب شعرا کو بلا کر ان کا کلام سنتے تھے۔ سیاسی مصروفیات کی بنا پر صورت حال شاید اندرا جی کے زمانے میں پیدا نہ ہوسکی، البتہ اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی ضرورت سے ان سے ملنا چاہتا تھا تو ضابطہ کے تحت اس کی ملاقات ہوجاتی تھی۔ ایک بار بزم شنکر وشاد اور دہلی کلاتھ ملز کے مرکزی کردار ڈاکٹر بھرت رام نے مشاعرہ کے دوسرے روز کچھ شعرا کو رات کے کھانے پر اپنی کوٹھی پر مدعو کیا، خبر یہ گرم تھی کہ عشائیہ کے بعد بھی ایک مختصر سی نشست ہوگی جس میں محترمہ اندرا گاندھی بھی شریک ہوں گی مگر جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو محترمہ اندرا گاندھی تو تشریف نہ لاسکیں البتہ محمد یوسف خاں صاحب جو اس زمانے میں شاید وزیرِاعظم کے ذاتی ایلچی تھے، ان کی نمائندگی کررہے تھے۔ چنانچہ اس روز بھی اندرا جی سے ملنے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

نہرو خاندان سے میری عقیدت اور اس کے افراد سے ملنے کی تمنا میں نے اپنے ننھیال سے ورثہ میں پائی تھی جس کی سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز شخصیت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ ان سے میری خالہ کا عقد ہوا تھا، آزادی کے قبل گرمیوں کی تعطیل میں جب کبھی میں ٹانڈہ جاتا یا ان دنوں میں جب مولانا مدنی آزادی کے بعد

سلہٹ کے بجائے رمضان شریف ٹانڈہ میں گزارتے تو جدوجہد آزادی کی پوری تصویر میری نگاہوں میں پھر جاتی جس میں جلیل القدر علمائے کرام کے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور نہرو خاندان کے افراد قید و بند کے مصائب کو رقصاں و غزلخواں طے کرتے ہوئے نظر آتے، میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا تھا اور ان کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز سے کما حقہٗ واقفیت بھی حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کے دو سال پہلے یعنی ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں میں نے عملی طور پر حصہ بھی لیا تھا اور ان جماعتوں کے امیدواروں کی موافقت میں تقریریں بھی کی تھیں جو مسلم لیگ کے خلاف تھیں، اور کانگریس کی معاون تھیں۔ اسی زمانے میں موجودہ ممبر پارلیمنٹ پروفیسر ہاشم قدوائی اور ان کے رفقائے کار کے ساتھ مل کر ہم لوگوں نے کل ہند پیمانے پر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن (مسلم لیگ کی طلبائی جماعت) کے خلاف نیشنلسٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی تاسیس کی تھی جس کا تفصیلی تذکرہ ہمارے ناموں کے ساتھ سی ریڈی کی کتاب ''اسٹوڈنٹس موومنٹ ان انڈیا'' میں مل سکتا ہے جو نیا زمانہ پبلی کیشن لکھنؤ نے آزادی سے قبل ۱۹۴۶ء میں شائع کی تھی۔ اسی وقت سے ہماری ذہنی اور فکری وابستگی نہرو خاندان کے افراد کے ساتھ ہوگئی تھی۔ ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک میں نے گورکھپور کی سرگرم طلبائی سیاست میں حصہ لیا تھا اور کانگریس کی معاون طلبائی تنظیموں کے مختلف عہدوں پر فائز بھی رہا۔ ۱۹۵۱ء میں میں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ لیکن نہرو خاندان سے جس نے نہ صرف ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا بلکہ نئے ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، میری عقیدت کم نہ ہوئی اور میں ہمیشہ اس موقع کا متلاشی رہا کہ اس کے افراد کو قریب سے دیکھوں۔

اندرا جی سے میری پہلی اور آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایک بہت ہی بڑے سیاسی سانحہ سے دو چار ہو چکی تھیں۔ جنتا پارٹی کی حکومت برسر اقتدار تھی اور اس کی تمام تر توجہ اندرا جی کے خلاف انتقامی کارروائیوں کی طرف مرکوز تھی۔ سرکاری عدالت

اور عوام کی عدالت دونوں نے ان کو رد کر دیا تھا۔ صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں ہے مگر میں جس دن ان سے ملا تھا اس کے دو ایک روز کے بعد وہ پنار آشرم ونوبا بھاوے سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی تھیں۔ ہوا یوں کہ میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا، بہت دنوں سے کلپ ناتھ رائے ممبر پارلیمنٹ (جو بعد میں مرکزی حکومت میں پارلیمانی امور اور توانائی کے وزیر بھی رہے) سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں جب میں ادبیات انگریزی کا لکچرر تھا، میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے مل کر ان کی خیریت پوچھتا چلوں، چنانچہ میں فیروز شاہ روڈ والی ان کی کوٹھی پر پہنچا، وہ حسبِ معمول مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو رہی۔ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو وہ بولے کہ ''میں اندراجی کے یہاں جا رہا ہوں اگر موقع ہو تو آپ بھی چلیے۔'' میں فوراً تیار ہوگیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سیاسی اور ذاتی سطح پر اتنے بڑے جھٹکے کے بعد ان کی افتادِ مزاج اور ان کی شکل وصورت پر کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ اندرا گاندھی، بین الاقوامی سطح پر جن کی شہرت کا ڈنکا بجا تھا، جنھوں نے ہندستان کی تعمیر وتشکیل میں اپنے خونِ جگر کو صرف کیا تھا، جن کے اسلاف نے مادرِ وطن کو آزاد کرانے میں طرح طرح کی قربانیاں دی تھیں، جنھیں ہندستان کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا، وہ اتنے بڑے انقلاب اور عروج و زوال کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد کہیں ایسا تو نہیں کہ عام انسانوں کی طرح پست حوصلہ ہوگئی ہوں۔ ہم لوگ ٹیکسی پر راستہ طے کر رہے تھے، مگر میرے تصورات میں اندرا گاندھی کا پورا ماضی، ان کے اسلاف، ان کے کارہائے نمایاں سب کے سب گردش کر رہے تھے۔ دس گیارہ بجے دن کا عمل ہوگا کہ ہم لوگ ان کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ بنگلے کے لان پر شامیانہ لگا ہوا تھا، جس میں کم وبیش تیس چالیس عورتیں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان عورتوں کی خواہش تھی کہ وہ اندراجی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھنچوا لیں۔ دالان میں کرسیاں دو قطاروں میں رکھی ہوئی تھیں جن پر کچھ مخصوص سماجی اور سیاسی کارکن بیٹھے ہوئے ملاقات کے منتظر تھے۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی، چہرے جانے

پہچانے لگے مگر میں ان کے ناموں سے نا آشنا تھا۔ صرف بیگم سلطانہ حیات اللہ انصاری کو میں پہچان سکا۔ کلپ ناتھ رائے ان دنوں مسز گاندھی کے بہت قریب تھے۔ انھوں نے جنتا حکومت کی پارلیمنٹ میں مسز گاندھی کے کارناموں، ان کے اکتسابات اور ان کے مناقب و فضائل پر ایک بے باک، نڈر اور بے خوف تقریر کی تھی۔ ایک ایسی فضا میں جب کہ گڑے مردے اکھاڑے جا رہے تھے اور انتقامی کارروائیاں اپنے شباب پر تھیں اور جن سے خود مسز گاندھی بھی محفوظ نہ تھیں، کلپ ناتھ رائے کی پارلیمنٹ میں وہ تقریر ان کی وفاداریوں کا ثبوت فراہم کرتی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں اندرا جی انھیں پسند کرتی تھیں۔ میں کلپ ناتھ رائے کے ہمراہ لان سے گزرتا ہوا دالان میں پہنچا، دالان کے آدھے حصے میں لوگ بیٹھے تھے اور آدھے حصہ کو پارٹیشن کر کے ڈرائنگ روم سے ملحق کر دیا گیا تھا۔ کلپ ناتھ رائے بغیر کسی تامل اور تکلف کے پارٹیشن کئے گئے حصہ میں داخل ہو گئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ یکا یک مسز گاندھی ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکلیں اور ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کلپ ناتھ رائے نے جھک کر قدم بوسی کی اور میں نے آداب کیا، انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، کلپ ناتھ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''یہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ہیں، ہمارے گرو، کالج میں مجھے انگریزی پڑھائی ہے، اردو کے شاعر۔''

''گرو جی آپ نے اس کو بھی کوئی سبق سکھایا ہے۔'' انھوں نے کلپ ناتھ کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر زندہ دلی سے مجھ سے پوچھا۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میری ملاقاتیں ملک کی اہم شخصیتوں سے رہی ہیں اور میں کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوا مگر اندرا جی نے جب آنکھ ملا کر مجھ سے سوال کیا تو میری صلاحیتیں سہم گئیں اور میں نے بڑی ہمت کر کے کھوکھلی آواز میں کہا۔

''میڈم! میں نے اس کو یہ سکھایا تھا کہ اچھے دنوں میں جس کے ساتھ رہنا خراب دنوں میں اس کا ساتھ مت چھوڑنا۔''

ایک لمحے کے توقف کے بعد انھوں نے دوبارہ کلپ ناتھ رائے کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولیں۔

''ہاں ہاں یہ سبق تو اس کو یاد ہے، مسلمانوں کا کیا حال ہے۔''

میں اس سوال کے لیے قطعی تیار نہ تھا، مگر جواب دینا بھی ضروری تھا، اس لیے بغیر کچھ سوچے سمجھے میں نے کہا۔

''میڈم، عام انتخابات کے وقت تو وہ آپ کے خلاف تھے، مگر رفتہ رفتہ ساتھ ہو رہے ہیں، تھوڑا سا وقت لگے گا۔''

نہرو خاندان کے افراد کا چہرہ ان کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب پر مسز گاندھی تھوڑا سا جھلا گئیں اور بولیں۔

''آپ یہ کہہ رہے ہیں اور ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے انصاری لیڈر جو ایک کانفرنس میں یہاں آئے ہوئے ہیں جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔''

اتنی دیر میں، میں اپنے حواس جو مرعوب اور پراگندہ تھے دوبارہ مجتمع کر چکا تھا۔ اس میں اندرا جی کے اندازِ گفتگو اور مشفقانہ برتاؤ کا بھی بڑا دخل تھا کہ میری سہمی ہوئی صلاحیتیں بہت جلد اپنے معمول پر آ گئیں۔ میں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''میڈم! ہندستان نہ تو چند انصاری لیڈروں کا نام ہے نہ ان خوش بختوں کا جنھیں آپ ذاتی طور پر جانتی ہیں، میں تو ان کروڑوں عوام کی بات کر رہا ہوں جو بغیر کسی سیاسی بصیرت کے الیکشن کے روز اپنا ووٹ ڈالتے ہیں۔''

ابھی میں اپنا جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ انھوں نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کو کیسے معلوم۔''

میں بولا، کلپ ناتھ نے ابھی آپ کو یہ بتلایا ہے کہ میں شاعر ہوں اور مشاعروں میں جاتا ہوں، اس طرح مجھے ادبی پلیٹ فارم سے کم و بیش پچاس ہزار عوام کا سامنا اوسطاً ہر مہینے میں کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ دیکھتا رہتا ہوں کہ شعرا کے مختلف اشعار پر ان کا

ردِّعمل کیا ہوتا ہے۔ الیکشن کے فوراً بعد جو مشاعرے ہوئے، ان میں ان اشعار کو سراہا گیا جن میں تبدیلی کا استقبال کیا گیا تھا مگر اب ایسے اشعار پر داد مل رہی ہے جن میں جنتا حکومت کے موجودہ نظام پر تنقید کی جاتی ہے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ موجودہ حکومت دن بدن عوام میں ناپسندیدہ ہوتی جا رہی ہے۔''

اندرا جی نے ایک بار پھر مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور بولیں۔

''میں کیا بتاؤں آج کل تو میں افواہوں میں گھری ہوئی ہوں۔ آج ہی کسی نے مجھے یہ بتایا کہ میں ڈیڑھ گھنٹے تک (ایک متعصب فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے لیڈر کا نام لیا جو مجھے یاد نہیں ہے) سے گفتگو کرتی رہی۔ حالانکہ میں نے ابھی تک انھیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں لوگ پھیلا رہے ہیں۔''

ابھی ہم گفتگو کے اسی مرحلہ پر تھے کہ اندرا جی کا کوئی سکریٹری اندر آیا اور اس نے کہا۔

''میڈم راجستھان کی بہت سی لیڈیز آئی ہیں، بڑی دیر سے آپ کی منتظر ہیں، آپ کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتی ہیں۔''

ہم نے اجازت چاہی، کلپ ناتھ رائے نے جھک کر پھر ان کے قدم چھوئے، میں نے آداب کیا۔ اندرا جی آگے بڑھتی ہوئی رکیں، مجھ سے بولیں۔

''جب بھی دہلی آنا، مجھ سے ضرور ملنا۔''

اور پھر وہ اس شامیانے میں چلی گئیں جو لان پر لگا ہوا تھا اور جس میں بہت سی عورتیں ان کی منتظر تھیں۔

جب ہم ان کے بنگلے سے نکلے تو دوپہر کا سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔

اندرا جی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، میں ان کی زندگی میں بارہا دہلی گیا مگر ان سے ملاقات کا کوئی عنوان پیدا نہ کر سکا، حالات کی تیز دھوپ کے باوجود ان کا وہ شگفتہ شاداب چہرہ، ان کی شفیق مسکراہٹ، ان کا بے تکلف مگر باوقار لب ولہجہ، ان کی وہ چمکدار ذہین آنکھیں آج بھی میرے تصورات میں زندہ اور محفوظ ہیں:

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

میں ان سے اس وقت ملا تھا جب وہ وزیر اعظم نہیں تھیں اور عوام نے بھی ان کو رد کر دیا تھا مگر ان کے تیور اس بات کے غماز تھے کہ آنے والے دنوں میں جیسے غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں گے، ان کی خدمات اور ایثار کا روشن اور تابناک چہرہ عوام کی نگاہوں میں اپنی صحیح قدر و قیمت کے ساتھ ابھرے گا اور وہ کروڑوں دلوں کی ملکہ بن جائیں گی۔ مستقبل نے ثابت کیا کہ ان کے یہ تصورات صحیح تھے۔

○■○

امریکہ میں مقیم شاعر

عزیز الحسن عزیز

بادِ مخالف کی زد پر اپنے چراغ کو روشن اور تابناک بنانے کا فن اردو شعر و ادب کو خاطر خواہ معلوم ہے۔ باوجود اس کے پچھلے چالیس بیالیس برسوں میں اردو اپنے وطن میں بے وطن ہوتی چلی گئی ہے اور برصغیر ہند و پاک کے عوام کا رشتہ اس سے کٹتا چلا گیا، مگر اس سخت جان نے مہاجرین کے ساتھ ہجرت کرنے اور نئی نئی بستیاں آباد کرنے کا ہنر اچھی طرح سیکھ لیا ہے۔ آج دنیا کے بہت سے ممالک میں اردو اپنے چاہنے والوں کے ساتھ اپنی بزم آرائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ انجمن سازی، مشاعرہ بازی، معاصرانہ چشمک، گروہ بندی، احباب نوازی کے درمیان صحت مند ادب کی تخلیق کا رویہ جو اس کی روایت میں ابتداء سے شامل رہا ہے دنیا کی مختلف ریاستوں خصوصیت کے ساتھ دبئی، شارجہ، ابوظہبی اور العین میں اردو شعرا کی کثیر تعداد موجود ہے۔ بحرین، عمان، قطر، کویت، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک میں شعرا و ادبا اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ انگلستان، کناڈا اور امریکہ کے علاوہ بہت سے ممالک مثلاً سوڈان اور ناروے میں اردو کے مراکز قائم ہیں اور بین الاقوامی سطح پر اردو مشاعروں اور مذاکروں کی روایت ارتقا پذیر ہے۔ ملایا، چین، جاپان اور جنوبی افریقہ میں اردو شاعری کے تبرکات موجود ہیں اور بنگلہ دیش میں اردو اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ اپنے وجود کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ مجھے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے بہت سے

ممالک کی ادبی تقریبات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور مشاعروں کی شب بیداری اس لیے بھی خوشگوار بن گئی ہے کہ چھوٹے بڑے شعرا ادبا کے ہجوم میں کبھی کبھی ایسی دولتِ بیدار ہاتھ لگ گئی ہے جس کی یاد میری زندگی کی متاع عزیز اور سرمایۂ نشاط ہوگئی ہے۔

عزیز الحسن عزیؔز کو میں نے نیویارک اور شکاگو کے بین الاقوامی مشاعروں میں غزل سرائی کرتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ اس مشاعرے میں ہند و پاک کے علاوہ برطانیہ کناڈا اور امریکہ سے آئے ہوئے شعرا نے شرکت کی تھی اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ شعرا اور شاعرات کے اس ہجوم میں جن لوگوں کے کلام نے مجھے متاثر کیا ان میں عزیز الحسن عزیز بھی شامل تھے۔ ان کے کلام کی جس نمایاں خصوصیت نے سامعین کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرایا وہ روایت کی چاندنی تھی جو ان کے تخلیقی رویہ میں شامل ہوگئی تھی اور جس میں انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کے خد و خال بہت ہی روشن اور تابناک نظر آ رہے تھے۔ میرے اس پہلے تاثر کی توثیق اس وقت بھی ہوئی جب کچھ دنوں کے بعد شکاگو کے ایک دوسرے مشاعرے میں میں نے ان کو سنا اور آج جب ان کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام کا مسودہ میرے سامنے ہے تو دیگر بہت سی اہم خصوصیات کے ساتھ جو دولتِ بیدار حاصلِ مطالعہ بن رہی ہے وہ روایت کا وہی ورثہ ہے جسے اقلیمِ سخن کی ایک نسل نے دوسری نسل تک بہت ہی زیادہ چھان پھٹک کر منتقل کیا ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ محض روایت کی پاسداری اور اس کا احترام کسی شاعر کو عظیم شاعر نہیں بناتا مگر اسی کے ساتھ ساتھ میں اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کرسکتا کہ روایت کو سلیقہ کے ساتھ برت کر اور تربیت یافتہ انداز میں اسے اپنا کر کوئی بھی شاعر اپنے خوش فکر ہونے کا ثبوت فراہم کرسکتا ہے۔ عزیز الحسن عزیز کی ذہنی تربیت اور تشکیل فکر کلاسیکی نہج پر ہوئی ہے اور انھیں شاعری کی مصدقہ روایتوں سے نہ صرف بے پناہ محبت ہے بلکہ ان کی شعری لسانیات کے بیشتر عناصر بھی روایتی ہیں اور انھیں سے ان کی

تخلیقات منور اور مستنیر ہیں۔ ان کے اشعار میں تخلیقی عوامل کا جو لہو گردش کر رہا ہے، وہ اپنی قدامت اور کہنگی کے باوجود تازہ دم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنے جذبے کی گرمی اور فنی مہارت سے اسے باسی ہونے نہیں دیا ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ کلاسیکی نظم و ضبط، صالح روایات کی پاسداری اور فنی رچاؤ کے رشتے ماضی کی قبائے صفات میں کہاں کہاں ملتے ہیں:

کچھ اس انداز سے وہ شوخ کھنتا جائے ہے مجھ سے
نہ ٹھہرا جائے ہے دل سے، نہ سنبھلا جائے ہے مجھ سے

بہت تھا ہوش کا جس بزم میں ہمیں دعویٰ
ہمارے ہوش اُسی بزم میں ٹھکانے لگے

اک طرف دوست ہے اور ایک طرف ہے غمِ دوست
اِس کو پا بھی نہ سکوں اُس کو گنوا بھی نہ سکوں

آنے کو تو آ پہنچے ہیں سب ہاتھوں میں سنگ لیے
دیکھیں اس موسم میں ہم پر پھینکے پہلا پتھر کون

ذکر یہ کس کا چھڑ گیا، انجمنِ رقیب میں
نام پہ کس کے آپ کی جنبشِ لب ٹھہر گئی

جب خیال آتا ہے لمسِ زلفِ برہم کا
آنچ دینے لگتی ہیں اپنی انگلیاں یارو

دل میں وہ موسم باراں ہے کہ اللہ اللہ
خشک ہوتا ہی نہیں دیدۂ تر کیا کیجے

ویسے تو ان کی ساری ادائیں حسین تھیں
سب سے حسین نام مرا بھولنا لگا

یادش بخیر تم سے بچھڑنے کے بعد سے
خود سے ملے ہوئے بھی زمانے گزر گئے

قہقہے برسا رہے تھے رات ہمسائے بہت
ہم بھی کھُل کر خوب روئے تم بھی یاد آئے بہت

اور اسی طرح کے بہت سے اشعار جو اس مجموعۂ کلام میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں، اس امر کے شاہد اور غماز ہیں کہ عزیز الحسن عزیز نہ صرف اردو شاعری کے پس منظر سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہیں بلکہ غزل کی قدیم اور زندہ روایات کو اپنی پوری توانائی اور حسن کے ساتھ برتنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔

عزیز الحسن عزیز کی شاعری کا ایک دوسرا رخ وہ بھی ہے جہاں انھوں نے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدہ حق اور قد و گیسو کی اصطلاح میں دار و رسن کا تذکرہ چھیڑا ہے اور جہاں عصری آگہی کے ہلکے سے پرتو نے اُن کی غزلوں کو محض رومانیت اور روایت پرستی سے بچا لیا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں ایک دور کی حقیقت ہر دور کی حقیقت میں تبدیل ہوگئی ہے اور غزل اپنی روایتی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے بھی عصری میلانات سے ہم آہنگ نظر آنے لگی ہے۔ عزیز الحسن عزیز زخموں کو چمن اور فریاد کو لَے میں تبدیل کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہے کہ غزل چھوئی موئی

کی طرح نہایت ہی شرمیلی صنف سخن ہے۔ سنگین اور بوجھل موضوعات کو اگر سلیقہ کے ساتھ نہ برتا گیا تو غزل نعرہ بازی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور فن کے آبگینہ پر خراشیں پڑجاتی ہیں۔ ان مراحل میں مکتب کی کرامات اور فیضانِ نظر دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں مقتل کو رنگِ حنا عطا کرنا اور نوکِ خار کو شمعِ رہگور بنانا پڑتا ہے۔ یہاں رموز و علائم کے ایسے طلسمی چراغ جلانے پڑتے ہیں جن کی روشنی میں الفاظ اپنے لغوی معنوں سے آگے بڑھ کر نت نئی فضاؤں کی تخلیق کرتے ہیں اور حدیثِ روزگار کو حکایتِ حسن بنا کر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ غزل کی اس کارگہ شیشہ گری میں سنگین مسائل کو جذبہ کی گرمی سے پگھلا کر سیال بنانا پڑتا ہے اور یہ سلیقہ بذاتِ خود ایک ایسی سعادت ہے جس پر جس قدر بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ عزیز الحسن عزیزؔ کے ان اشعار پر نگاہ ڈالیے اور محسوس کیجیے کہ سلاست اور نغمگی کے ساتھ محبت کی نرم و نازک زبان میں کس خوبصورتی کے ساتھ عصرِ حاضر کے کھردرے مسائل کو آئینہ دکھلایا گیا ہے:

میخانے کی تنظیم کا دعویٰ بھی بہت ہے
اور جام سنبھلتا بھی نہیں پیر مغاں سے

سراغِ قتل بھی معلوم، اسم قاتل بھی
گواہ شہر میں کوئی دکھائی دیتا نہیں

خموش رہ کے ہے ملزم کا منصفوں کو سلام
زباں بریدہ بیانِ صفائی دیتا نہیں

خون کے چھینٹوں سے مل جاتا ہے قاتل کا سراغ
سچ ہے لیکن تیرا رنگِ پیرہن دیکھے گا کون

مفتیِ دیں کا ہے شاہوں سے تقاضا کہ ہمیں
خلعت و جبہ و دستار و قبا دے جاؤ

صحرا صحرا گل بوٹے ہیں جن کی آبلہ پائی کے
بستی بستی اُن لوگوں پر سنگِ ملامت آج بھی ہے

مقتل مقتل دیوانوں نے کل بھی سر قربان کیے
قریہ قریہ منصوروں کو دار کی چاہت آج بھی ہے

کس طرح قانون توڑے جاسکیں
اس کے بھی قانون بنوائے گئے

رہِ وفا میں قدم قدم پر نئے نئے کربلا ملیں گے
جہاں ہوئی بھی تو تشنگی کا جواب جوئے فرات ہوگی

ان اشعار میں غزل کی مروّجہ اور روایتی اصطلاحات کے اندر ہمارے گرد و پیش کے نشیب و فراز کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ شاعر کی قادرالکلامی کا اشاریہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عزیز الحسن عزیز نے نئی اصطلاحات نہیں وضع کی ہیں، مگر قدیم اصطلاحات کو ہمارے عہد کے پس منظر میں نئی معنویت ضرور عطا کی ہے۔ انھوں نے نہ تو تنگنائے غزل کا شکوہ کیا ہے اور نہ اپنے عہد کے مسائل کو بیان کرنے کے لیے غزل کے مروّجہ مسلّمات اور مصدقات کو رد کر دیا ہے بلکہ روایتی غزل کے بنیادی لوازمات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اور اس کے تمام فنی لوازمات میں محدود رہ کر اپنے عہد کے مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ اُن کی فنی چابکدستی اور فکری تازگی کا امتزاج ہے کہ اُن کی

شاعری قدیم و جدید کی اصطلاحات سے اوپر اٹھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کی تشفی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

عزیز الحسن عزیز کا تہذیبی ورثہ بڑا ہی گرانقدر ہے جن احوال وظروف میں ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے اور جن اخلاقی قدروں کو وہ عزیز رکھتے ہیں ان کے کچھ حوالے ان کی غزلوں کے اشعار میں بھی ملتے ہیں۔ یہ اخلاقی قدریں یا تو روایت کے توسط سے ان تک پہنچی ہیں یا ان کے اسلاف نے نسلاً بعد نسلٍ ان تک منتقل کی ہیں۔ چونکہ میں ان کے ذاتی یا خاندانی احوال وکوائف سے قطعی واقف نہیں ہوں اور دو تین سرسری ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ میں نے زیادہ تر ان کو ان کے کلام میں تلاش کیا ہے اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ اخلاقی قدریں چاہے کسی بھی حوالے سے ان تک پہنچی ہوں، ہر دور میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں اور دیکھی جائیں گی۔ آج کے دور میں جب کہ ہماری تہذیبی شناخت انحطاط پذیر ہے اور انسانیت کی بہت سی اعلیٰ قدریں شکست و ریخت کے مرحلے سے گزر رہی ہیں، عزیز الحسن عزیزؔ کے یہ اشعار کتنے سکون پرور ہیں، اس کا خاطر خواہ اندازہ آپ انھیں پڑھ کر خود لگا سکتے ہیں:

فقر اپنی جگہ خزانہ ہے
دل غنی ہو تو مفلسی بھی نہیں

سچ بول کے جو عیش کی مسند سے اتر آئے
وہ لوگ بڑے صاحبِ کردار تھے لوگو

آپ سے مل کے عزیزؔ ایسے شجر یاد آئے
جتنے پھل دار ہوں اتنے ہی وہ جھک جاتے ہیں

پرکھا تو اُن سے چھوٹا کوئی آدمی نہ تھا
جو لوگ دیکھنے میں بڑے آدمی لگے

ہم کو بے نام دشمنوں کے سراغ
دوست کی دوستی سے ملتے ہیں

ہم نے حق بات کہی ہے تو زبانیں ہیں خموش
بول اُٹھی ہے حقیقت تو فسانے چپ ہیں

داغِ مفارقت کے علاوہ ہر ایک داغ
اس داغ داغ دل کو گوارا ہے دوستو

اخلاق و معارف، بصائر و تاملات، خود بینی و جہاں بینی، غزل کے فنی لوازمات کو برتنے کا سلیقہ، شاعری کی مسلمہ روایات کا احترام، بجتی ہوئی بحروں میں غزلیں کہنا، نغمگی اور آہنگِ صوتی کو برقرار رکھنا، بڑی ہی نرم و نازک، تربیت یافتہ اور شائستہ انگلیوں سے گیسوئے دوست اور زلف گیتی دونوں کو اپنی غزلوں میں سنوارنا، جناب عزیز الحسن عزیزؔ کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ اردو کی سرزمین سے بہت دور نہ صرف شعر و ادب کی شمعیں فروزاں کیے ہوئے ہیں بلکہ امریکہ کی تیز رفتار اور مادّی دنیا میں ان قدروں کے ترجمان، شارح اور وصاف ہیں جو مشرق کے لیے باعثِ فخر و افتخار رہی ہیں۔ دیارِ غیر میں اپنی لسانی، ادبی اور تہذیبی روایات کا تحفظ کرنا اور ان قدروں کو سینہ سے لگائے رکھنا جو کینیڈا اور امریکہ میں بسنے والے اردو کے ''مہاجر شعرا'' رفتہ رفتہ بھولتے چلے جارہے ہیں، ایک ایسی سعادت ہے جس پر جس قدر بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ عزیز الحسن عزیزؔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنا ادبی سفر سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھیں گے اور بغیر کسی نفسیاتی الجھن کے اردو غزل کی ان صالح روایات کے محافظ، امین اور نقیب رہیں گے جو صدیوں کا سفر طے کر کے متقدمین سے ہم تک پہنچی ہیں۔

سلیم جعفری

اپنے خطوط کے آئینے میں

(جنھوں نے خلیجی ممالک میں عصرِ حاضر کے شاعروں کے جشن منانے کی روایت قائم کی)

اردو کی سخت جانی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب اس پر اپنے وطن میں کڑا وقت پڑا تو اس نے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی نوآبادیاں بنالیں اور تلاشِ معاش میں جانے والے مہاجرین کے ساتھ ساتھ دور دراز ممالک میں نکل گئی۔ اردو کی ہجرت ادبی اور لسانی دونوں سطحوں پر ہوئی۔ چنانچہ آج دنیا کے مختلف ممالک میں نہ صرف اردو کے شاعر، ادیب اور افسانہ نگار ملیں گے بلکہ ایسی فعال اور متحرک شخصیات بھی ملیں گی جنھوں نے اردو کی لسانی جمہوریت کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور اس کی ترویج و اشاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ سلیم جعفری اردو کے ان مجاہدین میں شامل ہیں جنھوں نے خلیجی ممالک کو اپنا میدانِ عمل بنا کر اردو کے ادارہ رابطۂ عامہ یعنی مشاعرے کے حوالے سے ایسی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں جن کا معترف و مداح صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں بلکہ اردو سے محبت کرنے والا ہر عام سامع بھی ہے۔ انھوں نے مشاعرے کے منظرنامے کو نہ صرف روشن اور تابناک بنایا ہے بلکہ اسے نوک پلک سے درست کرکے پایۂ اعتبار کو بھی پہنچایا ہے۔ ہمارے عہد کا ہر دانشور اس بات پر متفق ہے کہ مشاعروں کی بڑھتی ہوئی تعداد خوشگوار ضرور ہے مگر اس کا ادبی اور تہذیبی وقار انحطاط پذیر ہے۔ سلیم جعفری نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ ان کی سربراہی میں منعقد ہونے والے مشاعرے میرؔ کے الفاظ میں خواص پسند ہونے کے ساتھ عوام سے بھی گفتگو کریں اور ان کی تہذیب و تربیت میں اپنا منصبی کردار ادا

کریں۔ ایک ایسی نسل کو جس کا رشتہ ماضی کی صالح ادبی قدروں اور روایات سے روز بروز ٹوٹ رہا ہو اور جس نے واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے کے بجائے تالیاں بجا کر داد دینے کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہو، ایک متوازن اور ادبی مشاعرہ سنوارنا کتنا دشوار اور جان لیوا عمل ہے، اس کا اندازہ کوئی بھی شخص کرسکتا ہے۔ مگر سلیم جعفری کے عزم اور حوصلہ کو داد دی جائے کہ انھوں نے ہمت نہ ہاری اور خوب سے خوب تر کی جانب ان کا سفر جاری ہے۔ ''بیادِ فیض'' کے پہلے مشاعرے کے بعد انھوں نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا:

> ''ایک اور ضمن میں آپ کا مشورہ درکار تھا اور وہ یہ ہے کہ کیا آپ اس تجویز کو مناسب سمجھیں گے کہ ہم اگلے مشاعرے کو ''بیاد'' کے بجائے ''جشن'' میں بدل دیں۔ تجویز یہ ہے کہ اگلا مشاعرہ بعنوان ''جشنِ خمارؔ'' ہو۔ یوں ہم بجائے ادب کے محسنوں کی یاد منانے کے ان کی زندگی ہی میں اپنا فرض اور ان کا قرض ادا کردیں''.....
>
> یوں ہر سال کسی نہ کسی ادیب کو اس کی زندگی ہی میں خراجِ تحسین ادا کرنے کی رسم اجرا چاہتے ہیں اور قدرے مالی خدمت بھی گویا ایک معقول رقم ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ یہ رقم پچیس تا پچاس ہزار روپے تک ہوسکتی ہے۔ ابھی اس ضمن میں ہم نے خمارؔ صاحب سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ پہلے آپ کا مشورہ درکار ہے اور مضمرات کی نشاندہی بھی، مضمرات سے مراد معاصرانہ چشمک ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ہمعصر شعرا اس مشاعرے میں شرکت کو اپنی ''انا'' کا مسئلہ بنالیں۔ لہٰذا اسی مرحلہ پر آپ کی رہنمائی ضروری سمجھی۔ پاکستانی شعرا کی جانب سے ہمیں کوئی اندیشہ لاحق نہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری تجویز اور انتخاب سے اتفاق فرمائیں گے۔
>
> منظور صاحب! اگر آپ ہماری ''جشنِ خمارؔ'' کی تجویز سے اتفاق

فرمائیں تو پھر ساتھ ہی یہ التماس بھی گوش گزار کردوں کہ ہمیں خمارؔ صاحب کی اور خمارؔ صاحب پر بہت کچھ تحریری مواد درکا ہوگا کیوں کہ پھر مجلّے کا بیشتر حصہ ان تحریروں پر مشتمل ہوگا جو خمارؔ صاحب کی شخصیت اور فن کا مظہر ہوں گی اور یوں آپ کی مصروفیات میں ایک اور اضافہ ہوجائے گا۔ مختلف صائب اور صاحب الرائے صاحبان قلم کی مختصر جامع آراء درکار ہوں گی، تمام شریکِ جشن شعرا کی آراء بھی۔ ہاں اپنے جہل کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی دریافت کرلوں کہ خمارؔ صاحب کے اب تک کتنے مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ اگر وہ مجموعے مل جائیں تو بہت اچھا ہے کیوں کہ پھر ان مجموعوں سے ہم خمارؔ صاحب کا منتخبہ کلام مجلّے میں شائع کرسکیں گے۔''

آپ ان کے اس خط کے اقتباس سے اندازہ خاطر خواہ لگا سکتے ہیں کہ مشاعرہ سلیم جعفری کے لیے وقت گزاری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اسے باقاعدہ طور پر ایک ادبی فریضہ تصور کرتے ہیں اور اسے شعرا اور ادبا کے لیے ایک مفید ادارہ اور ایک باوقار تنظیم بنانا چاہتے ہیں۔ اس عمل میں انھیں کتنی دشوار گزار وادیوں کو طے کرنا ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ ایک دوسرے خط سے لگا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''میرے مقامی احباب 'بیادِ فیض' مشاعرے کی کامیابی اور نیک نامی کا صدمہ ابھی تک برداشت نہیں کر پا رہے تھے لہٰذا آپ بغضِ معاویہ میں ۱۱؍ستمبر ۱۹۸۶ء کو ایک عالمی مشاعرے کے انعقاد کا اعلان فرما چکے ہیں۔ گو اس اعلان سے 'جشنِ خمار' کی صحت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ البتہ میری صحت کا معاملہ قدرے مختلف ہورہا ہے۔ بھاگ دوڑ میں اضافہ، اشتہارات اور ادارتی مواد کے حصول میں دشواریاں درپیش ہیں۔ اشتہارات اس لیے

کہ مسابقات کا بازار گرم ہے اور اداراتی مواد میسر نہیں آرہا ہے۔
اب تیسرا محاذ جو کھلنے جارہا ہے وہ شعرائے کرام کی مناسبت سے کھل سکتا ہے۔ وہ یوں کہ برادرانِ یوسف انڈو پاک کے شعرا کو دعوت نامے بھیجنے کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں۔ ان کا خصوصی ہدف میرے مہمانانِ گرامی ہیں... 'بیادِ فیض' سے قبل بھی ان حضرات نے ایک عالمی مشاعرہ منعقد کرنے کی ٹھانی تھی، مگر تھک ہار کر بیٹھ رہے تھے۔ اس بار نسبتاً زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے وارد میدان ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے عزم اور ارادے کا اظہار اخبارات کے ذریعہ کیا اور حلقۂ غنیم کو دعوت دی ہے کہ ہو سکے تو میرے مہمان شعرا کو ورغلا کے دکھاؤ۔ گویا صورت چیلنج کی سی ہے۔ بعض احباب درمیان میں آئے اور مشورہ دیا کہ میں مشاعرے کی تاریخ میں رد و بدل کر دوں۔ میرا جواب حتمی انکار تھا جسے میری ضد، ہٹ دھرمی اور غرور بیجا سے گردانا گیا۔ میرا کہنا صاف یہ تھا کہ میں ہند و پاک جاکر اپنے مہمانوں سے مل کر یہ تاریخ طے کر کے آیا ہوں۔ خاصے مہمان سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ ان کی چھٹیوں کی تاریخ بار بار تبدیل نہیں ہوسکتی۔
اب مقابلہ جاری ہے، اسے اعصابی جنگ ہی کہا جاسکتا ہے۔
حلقۂ غنیم میں وہ مقامی شعرا بھی شامل ہیں جنھیں ہر دفعہ عالمی مشاعروں میں نہیں پڑھایا جاسکتا۔ یہ سبب ہے ان کی خفگی کا خیر۔"

جب کوئی آدمی میدان عمل میں اُترتا ہے تو اس کو کن کن دشواریوں سے گزرنا ہوتا ہے اور کن کن سطحوں پر اس کی مخالفت ہوتی ہے، اس کا احساس ان تمام حضرات کو ہوگا جو ادبی کاموں کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ سلیم جعفری نے دراصل بادِ مخالف کی زد پر اپنا سفر یقین محکم اور عمل پیہم سے آسان کیا ہے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''منظور صاحب! میں ماہ اگست میں غالباً لکھنؤ آؤں۔ ۵راگست سے میری سالانہ تعطیلات شروع ہوں گی..... میری اہلیہ ساتھ ہوں گی، انھیں ہندوستان کی سیر کا شوق ہے اور مجھے 'جشنِ خمارؔ' کے ضمن میں بھاگ دوڑ کرنا ہے۔ میرے لکھنؤ آنے تک اگر آپ خمارؔ صاحب پر ایک بھرپور تعارفی خاکہ لکھ رکھیں تو اچھا ہو، اور اگر کتابت بھی ہوجائے تو میری خوش نصیبی..... آپس کی بات ہے میری خواہش ہے کہ مشاعرے میں ایک سے زائد غیر مسلم شاعر ہوں تاکہ اردو پر صرف اور محض مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام نہ دہرایا جاسکے۔ بعض احباب نے آپ ہی کے شہر کے کرشن بہاری نورؔ کی سفارش کی ہے اگر آپ میرے احباب کی رائے سے متفق ہوں تو نورؔ صاحب سے بات کرر کھیں.....''

کم وبیش گزشتہ چالیس برسوں سے مشاعرہ میرا مقدر اور سفر میرا معمول بن چکا ہے۔ ہند و پاک کے علاوہ دنیا کے نہ جانے کتنے ممالک اور شہروں کے دعوت نامے میرے پاس موجود ہیں۔ مگر اردو زبان کی تاریخی حقیقت یادگاری مجلّہ کی اشاعت معاصرین کا حسد اور جلن، شعرا کا انتخاب ان تمام تفصیلات پر سلیم جعفری کی جو نگاہ ہے وہ شاید ہی اس عہد میں کسی کے پاس ہو اور اسی لیے میرا ہمیشہ سے یہ یقین رہا ہے کہ سلیم جعفری کے ہاتھوں میں مشاعرہ ایک کاروباری مشغلہ نہیں بلکہ ایک ادبی اور تہذیبی عمل ہے اور اگر ان جیسے دوچار اردو رضا کار ہمیں مل جائیں تو اردو صرف چند مخصوص ملکوں کی چہار دیواری تک محدود نہ رہے بلکہ ساری دنیا کو اپنا وطن بنالے۔

اب ذرا ایک اور خط ملاحظہ کیجیے۔ میں نے ایک مرتبہ انھیں یہ لکھا کہ جب آپ ہر برس اتنے بڑے عالمی مشاعرے کرتے ہیں تو خود دو ایک غزلیں کہہ کر شاعر کیوں نہیں بن جاتے۔ انھوں نے مجھے لکھا:

''دو ایک غزلیں کہہ ڈالنے والا مشورہ دہشت ناک تھا۔ قبلہ آپ

بخوبی واقف ہیں کہ آدھا مصرعہ تک موزوں نہیں کرسکتا تو غزلیں کہاں سے ہوں۔''

مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ان کو شاعر بننے کا مشورہ دوں گا اور وہ اس کو ٹھکرا کر میرے رقیب بن جائیں گے اور مشاعروں کی نظامت کرنے لگیں گے اور وہ بھی اس ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہ دنیا کے مختلف ممالک میں لوگ ان کی گل افشانی گفتار سننے کے لیے مدعو کرنے لگیں گے۔ وہ انبالہ مشاعرہ میں آئے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ انھوں نے اتنی خوبصورت نظامت کی کہ میں دنگ رہ گیا۔ میں نے ان کے جانے کے بعد ان کی کامیاب نظامت پر مبارک باد دی۔ انھوں نے حسب معمول کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے مجھے لکھا:

''انبالہ میں ایک سخت امتحان سے گزر چکا ہوں۔ آپ جسے میری کسرنفسی پر محمول کرتے ہیں، وہ بخدا کسر نفسی نہیں ہوتی۔ آپ ان چند مخصوص کرم فرماؤں میں ہیں کہ جن کے حضور میں جیسا ہوں ویسا ہی ہوتا ہوں۔ میں نہ ادیب، نہ شاعر، نہ نقاد، نہ مدیر نہ صحافی، تو کس حوالے سے رائے دوں۔ یہ حوالہ کوئی زیادہ معتبر حوالہ نہیں۔ میں یہاں جشن منعقد کرتا ہوں کم از کم ادبی اعتبار سے یہ معتبر حوالہ نہیں۔ انبالہ کے مشاعرے کے بعد دو چار توصیفی خطوط ملے جن میں میری ہمت افزائی فراخ دلی سے کی گئی جسے میں نے احتیاج جانا۔ ایک صاحب نے یہ رائے دی کہ 'ملک زادہ صاحب کے بعد آپ کی نظامت معیاری لگی' تو اس رائے نے سکونِ قلب دیا۔''

سلیم جعفری سے جب میں پہلی بار ملا تو میں نے انھیں محض ایک بڑے مشاعرہ کا کنوینر سمجھا۔ دو چار دن کے دورانِ قیام میں پتہ چلا کہ ادب اور مذہبیات کے مختلف موضوعات پر ان کا مطالعہ وسیع اور ان سے اخذ کردہ نتائج معقول اور متوازن ہیں۔ لکھنؤ میں وہ اپنی بیگم کے ساتھ دو چار روز میرے مہمان ہوئے تو یہ راز کھلا کہ وہ ایک

بے تکلف دوست اور زندہ دل انسان ہیں جو ہر ماحول میں اپنے حسن اخلاق اور شرافت نفس کا سکہ بٹھلا سکتا ہے۔ انبالہ میں ان کو مشاعرے کی نظامت کرتے دیکھا تو یہ احساس یقین میں تبدیل ہوا کہ وہ نہ صرف ادب کے منظرنامہ سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہیں بلکہ مشاعروں کو موجودہ تہذیبی اور ادبی انحطاط سے نکالنے کا صالح جذبہ بھی رکھتے ہیں اور آج جب میں نے ان کے خطوط کو دوبارہ پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ وہ شاعر بنیں یا نہ بنیں، ادیب ہوں یا نہ ہوں مگر ایک اچھے مکتوب نگار ضرور ہیں۔

علامہ تاج الفحول
نعتیہ شاعری کے آئینے میں

اپنے فکری امتیازات اور فنی التزامات کے حوالے سے اصنافِ سخن میں نعت کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ فکری سطح پر یہ صرف ایک ہی ذاتِ گرامی کو اپنا ممدوح بناتی ہے اور فنی سطح پر ایسے الفاظ و ضمائر کا استعمال کرتی ہے جو اس عظیم المرتبت شخصیت کے وقار اور مرتبے سے ہم آہنگ ہو جائیں جس کا مداح خود خالقِ کائنات اور اس کے ملائکہ ہیں اور جس کا نازل کیا ہوا قرآن خود ایک مجموعۂ نعت ہے۔ مبالغہ جو اردو شاعری اور خصوصیت کے ساتھ قصائد میں غلو اور اغراق کی منزلوں کو چھو لیتا ہے۔ اگر اس میں شامل ہو جائے تو شرک ہو کر شاعر کو کافر اور زندیق بنا دیتا ہے۔ اگر حفظِ مراتب میں ذرا سی کمی واقع ہو جائے تو شاعر اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے اور پُل صراط کو سلامت روی کے ساتھ پار کرنے کا فن ہے اور اِسی لیے عرفی جیسے شاعر کو یہ کہنا پڑا:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

اور بیدل جیسے شاعر نے گھبرا کر یہ کہہ دیا تھا:

زلافِ حمد و نعت اولٰی است بر خاکِ ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

نعت گوئی دراصل تضادِ شعر و شریعت کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کا فن ہے کہ شاعری

شریعت اور شریعت شاعری میں تبدیل ہو جائے اور یہ کام وہی فنکار کر سکتا ہے جو شاعری پر قدرت اور شریعت کے رموز و نکات سے خاطر خواہ واقفیت رکھتا ہو اور اسی لئے میں اگر یہ کہا جائے کہ نعت گوئی کا سلسلہ خدائے بزرگ و برتر سے شروع ہو کر ملائکہ اور قدسیوں کی جماعت میں ہوتا ہوا انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتا ہے اور پھر صحابۂ کرام، ائمہ عظام، اولیائے کبار اور صوفیوں کی خانقاہوں سے ہوتا ہوا شعرائے کرام تک پہنچتا ہے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک حدیث تو یہ بھی ہے کہ نبی کریمؐ نے اس بات کی تصدیق فرماتے ہوئے کہ آدمؑ صفی اللہ، نوحؑ نجی اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ ہیں، صحابہؓ سے پوچھا مجھے بھی پہچانتے ہو اور فرمایا:

''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ یہ بیان واقعہ ہے فخر یہ نہیں، میں پہلا وہ شخص ہوں گا کہ جنت کے دروازوں کو حرکت دے کر اس میں داخل ہوں گا اور میرے ساتھ مسلمان فقراء ہوں گے اور مجھے کوئی فخر نہیں اور اس دن اللہ کی حمد و ثنا کا پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا اور حضرت آدمؑ اور ان کے سوا دوسرے لوگ میرے پرچم کے نیچے ہوں گے اور میں اللہ کا محبوب خاص ہوں (یہ بیان واقعہ ہے فخر نہیں)۔''

نبی کریم کے بعد حضرت حسانؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن رواحہ، کعبؓ بن زہیر جیسے جلیل القدر صحابہ نے اس سنتِ نبوی کی پیروی کی اور اپنے زہد و تقویٰ، علم و فضل اور قدرتِ شاعرانہ سے نعت کا حق ادا کیا، سرفرازی حاصل کی۔ حسانؓ بن ثابت نے کہا:

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے بھیجا اپنے بندہ کو رسول بنا کر اپنی نشانیوں کے ساتھ اللہ کی قسم وہ اعلیٰ و افضل ہے۔''

(عربی سے ترجمہ)

عبداللہؓ بن رواحہ نے فرمایا:

''ان کے فضائل و کمالات کا یہ چشمۂ فیض تمام بندوں کو بلا امتیاز

اس طرح سیراب کر رہا ہے جس طرح آفتاب و ماہتاب کی ضیاباریاں۔ اگر اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرنے والی نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو خود اس کی ذات اس کے پیغام کی صداقت کے لیے کافی ہوتی۔'' (عربی سے ترجمہ)

اسی طرح حضرت کعبؓ بن زہیر نے لکھا:

''بیشک اللہ کے رسول البتہ نور ہیں، روشنی حاصل کی جاتی ہے اُن کی ذات سے اور سیف قاطع ہیں اللہ کی سونتی ہوئی تلوار سے۔''

(عربی سے ترجمہ)

حضرت علیؓ نے فرمایا:

''بلاشبہ بندے نے اطاعت کی رب جلیل کی اور پیروی کی بلانے والے کی بھی جو نبی اور رسول ہیں پس رحمتِ کاملہ نازل ہو، خداوند تعالیٰ کی اُن پر مسلسل رات کی تاریکیوں میں صبح اور شام۔''

(عربی سے ترجمہ)

خاتون جنت جناب فاطمہ زہراؓ نے فرمایا:

''کیا چاہیے اس کو احمد کی تربت کو سونگھے اس کو چاہیے کہ عمر بھر کوئی خوشبو نہ سونگھے۔'' (عربی سے ترجمہ)

نعت گوئی کا یہی پاکیزہ اور طاہر سلسلہ جب عربی سے ہوتا ہوا فارسی اور اردو تک پہنچا اور محبِ رسولؐ حضرت تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی نے بارگاہِ رسالت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا تو ان کے ایک ایک حرف سے نہ صرف عشقِ رسالت ٹپکا بلکہ ان کے قلم نے ناموسِ رسالت کا تحفظ کر کے سچے عاشق رسول ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا۔

اس المیے کا ماتم کہاں تک کیا جائے، کہ اردو تاریخ ادب نے ہمارے ان علمائے کرام کو تقریباً یکسر نظرانداز کر دیا ہے جنھوں نے دین اور سنت کی چاکری کے ساتھ

ساتھ رشد و ہدایت کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور تبلیغ دین کے لیے تصانیف کے انبار لگا دیے، علمائے کرام کے ملفوظات اور ان کی دیگر تصانیف کو اگر تاریخِ ادب اور تاریخِ لسانیات نے موضوعِ گفتگو بنایا ہوتا تو ہماری زبان و بیان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ اُجاگر ہوکر اردو کا ایک نیا منظرنامہ پیش کرتیں۔ حضرت محمد عبدالقادر محبّ رسول جو اعلیٰ حضرت تاج الفحول کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، اور جن کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے ملتا ہے۔ ۱۲۵۳ھ میں مدینۃ الاولیاء بدایوں شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگوں میں حضرت قاضی دانیال قطریؒ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے، اور جب قطب الدین ایبک نے بدایوں فتح کیا تو آپ کو وہاں کا قاضی مقرر کیا گیا۔ آپ کا سلسلۂ نسب سولہویں پشت میں حضرت عثمان غنیؓ تک پہنچتا ہے۔ قاضی دانیال قطریؒ کے زہد و ورع، علم و عمل، پاکیزگی و دیانت داری کی شہادتیں بہت کتابوں میں ملتی ہیں، جن میں خصوصیت کے ساتھ ''اکمل التاریخ'' قابلِ ذکر ہے۔ اعلیٰ حضرت تاج الفحول کے اسلاف میں قاضی شمس الحق، قاضی سعد الدین، بحرالعلوم مولانا محمد علی مفتی عبدالغنی، مفتی محمد عوض، حضرت شاہ عین الحق کے اسمائے گرامی شامل ہیں اور یہ سبھی حضرات اپنے دور کے جید عالم اور جامع کمالات شخصیات کے مالک تھے اور تاج الفحول کے والد ماجد سیف اللہ المسلول حضرت شاہ فضل الرسول بدایونی عالم و فاضل اور عابد و زاہد ہونے کے علاوہ حنفی مذہب کے جید عالم تھے اور ردِ وہابیت میں انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ آپ کے مریدین صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ بکثرت اشخاص نے ہندوستان کے باہر بھی آپ سے کسبِ فیض کیا تھا، علامہ تاج الفحول آپ کے چھوٹے صاحب زادے تھے، آپ کی ذہانت اور ذکاوت کے چرچے عام تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے آپ کی شان میں 'چراغ انس' کے عنوان سے جو قصیدہ نظم کیا ہے، اس سے آپ کے جید عالم اور یکتائے عصر ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ آپ نے مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں رہ کر مختلف علوم وفنون کی مہارت حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ قادریہ

بدایوں میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ہزاروں تشنگانِ علوم کو سرفراز کیا۔ 'چراغ انس' کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں نے اپنے ایک دوسرے قصیدے ''آمال الابرار و آلام الاشرار'' میں بھی ان کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اور تمام علماء کے پیشوا حضرت تاج الفحول کے امام جن کی کوئی نظیر نہیں اور تم کیا سمجھتے ہو کیا ہیں تاج الفحول وہ جنھیں عزت کی بزرگی سے اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی اور انھیں حقیقتاً اپنے فضل کا تاج پہنایا رسول اللہ نے ،جن کی مخالفت کی کسی کو گنجائش نہیں۔''
>
> (عربی سے ترجمہ)

حضرت تاج الفحول کا وصال ۱۳۱۹ھ میں ایک ہفتہ کی علالت کے بعد ہوا اور بعد نمازِ فجر عیدگاہ شمسی میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور والدِ بزرگوار کے پہلو میں انھیں دفن کیا گیا۔ تاج الفحول کا انتقال ایک فردِ واحد کا انتقال نہ تھا ان کے ساتھ علم وفضل، تصنیف و تالیف، زہد و ورع، وعظ و تقریر کا ایک معتبر ادارہ دفن ہوا مگر انھوں نے تبرکات کی شکل میں اپنی جو تصانیف چھوڑیں اور اپنے روحانی تصرفات سے خلقِ خدا کو جو فائدہ پہنچایا وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

علامہ تاج الفحولؒ ایک کثیر التصانیف بزرگ، ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں اور رسائل شائع ہوکر منظرِ عام پر آگئے ہیں مگر ان کی تصانیف کا ایک بڑا حصہ آج بھی مسودوں کی شکل میں غیر مطبوعہ ہے۔ عقائد اور دینی موضوعات پر لکھتے ہوئے انھوں نے تلاش وتحقیق، جستجو و آرزو اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور اپنے اخذ کئے ہوئے نتائج کی تائید قرآن اور حدیث سے کی ہے۔ ان کی چند مطبوعہ اور معروف تصانیف میں 'احسن الکلام فی تحقیق عقائد السلام'، 'اشعار رسائل فی تحقیق مسائل'، 'حقیقۃ الشفاعۃ علی طریق اہل سنۃ والجماعۃ' کے علاوہ تاریخ بدایوں، 'تصحیح عقیدہ فی باب امیر معاویہ'، 'حرزِ معظم'، دیوانِ نعت و مناقب عربی'، 'دیوان منقبت فارسی'، 'دیوانِ منقبت'

اردو دو جلدوں میں شامل ہے۔ ان کی غزلوں اور نعتیہ و منقبتیہ کلام کا ایک بڑا حصہ آج بھی غیر مطبوعہ ہے۔ اپنے ایک منقبتیہ مجموعۂ کلام ''بہارستانِ منقبت'' کے مقدمہ میں اپنے کسرِ نفس کا اظہار کرنے کے بعد کتاب کی شانِ نزول کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

ایک مدت سے اثنائے سفر دربارِ مدینہ و نجف اشرف و کربلائے معلٰی و بغداد شریف و اجمیر شریف وغیرہ میں ہر جگہ بطور عرض حال پریشاں کے وقت حاضری آستان فیوض نشاں اتفاق نظم کر لینے، اشعار نعت و منقبت کا عربی و فارسی و اردو میں بہ شوق قلبی ہوا لیکن چونکہ اپنے کلام کو پیش کرنے کے قابل خدمت علمائے کبار و شعرائے روزگار میں نہ سمجھا اور نہ ثبوت کی غرض سے اس کلام کو نظم کیا تھا۔ ازیں جہت قصد صاف کرنے مسودات کا بھی نہ کیا گیا تا آنکہ بہت سا کلام عربی و فارسی و اردو کا مفقود بھی ہو گیا۔ قریب زمانہ گزر کر احباب بعد ضائع ہو جانے مسودات مفقودہ کے مسودات موجودہ کو صاف کیا اور ایک مجموعہ چار دیوان پر ترتیب دیا۔ دیوان اول قصائد عربیہ نعت و منقبت میں، دیوان دوم قصائد و غزلیات فارسی میں، دیوانِ سوم غزلیات اردو نعت شریف میں، دیوان چہارم غزلیات اردو مناقب خاص جناب محبوب سبحانی میں، اب ان ایام میں کہ بزرگانِ دین نے واسطے طبع کرانے بعض قصائد و غزلیات اس مجموعہ کے بطور اختصار ارادہ فرمایا۔ فقیر حقیر نے ان کے اصرار سے سوائے اجازت کے چارہ نہ پایا۔''

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت تاج الفحولؒ نے شاعری کا بھی کافی ذخیرہ چھوڑا تھا جس کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا مگر جو کچھ بچا وہ بھی چار دواوین عربی، فارسی اور اردو پر مشتمل تھا مگر وہ سب شائع نہ ہو سکا بلکہ بطور اختصار 'بہارستان منقبت' میں پیش

کیا گیا۔ بہر حال جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نعتیہ اور منقبتیہ کلام میرے پیشِ نظر ہے اس کی قدر و منزلت کا تعین کرنے میں چراغ راہ بن کر مندرجہ بالا اقتباس کی مزید چند سطریں معیار و میزان کی حیثیت رکھتی ہیں، جن پر موصوف کے کلام کو پرکھا جاسکتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> ''بہت احادیثِ صحیحہ سے سننا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اشعار حمد و نعت کو اور نیز حکم فرمانا حضرت حسانؓ وغیرہ کو واسطے نظم کرنے ہجو کفار کے بخوبی ثابت ہے۔ پس اطلاق مذمت شعر کا علی الاطلاق خلاف تحقیق و تطبیق ہے۔ ہاں البتہ بہت شعرا جو شرع کے احکام فقہ و عقائد اسلام کے خلاف کرنے کو کمال لطف شاعری گردانتے ہیں۔ مثلاً اولیائے کرام کے مناقب میں بمقابلہ ان کے تنقیص انبیائے کرام کی اور تفضیل دینا ان پر اور اہلِ بیت و صحابہ کے مناقب میں بمقابلہ ان کی تنقیص انبیائے کرام کی، اور تفضیل دینا ان پر اور نعت شریف میں گستاخی اور بے ادبی حق سبحانہ کی گویا لازم جانتے ہیں اور جو ایسے شاعروں کے معتقد علم یا فقر کے ہوتے ہیں وہ ایسی ہی خرافات کو کمالِ معرفت گردان کر بہ دل و جان مشعلِ ایمان مانتے ہیں سو بیشک ایسے علمائے دین ایسے اشعار کی ممانعت فرماتے ہیں۔''

حسبِ بالا اقتباس کا اگر غائر نگاہوں سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ حضرت تاج الفحول صرف ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک بالغ نظر ناقد اور ادیب بھی تھے۔ انھوں نے نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کا جو معیار و میزان چند جملوں میں پیش کیا ہے وہی اصل اور بنیادی اساس ہے۔ جس پر ہم مختلف زبانوں کی نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کو پرکھ کر اس کی قدر و قیمت کا تعین کرسکتے ہیں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، اس صنف کی شاعری کے کچھ اور مطالبات بھی ہیں جن کو پورا کیے بغیر کوئی بھی شاعر اس

وادی سے رقصاں و غزلخواں گزر نہیں سکتا۔ فرماتے ہیں:

''اس وقت میں بہت نظم کرنے والے نعت و مناقب کے پرواہِ نقل وصحت کے ساتھ اسانید صحیحہ و معتمد یہ کے نہیں کرتے۔ ہر رطب و یابس کو خاص کر روایات شاذہ غیر مشہورہ کو، گو خلافِ روایات متواترہ بلکہ خلافِ قرآن کے ہوں بلکہ واسطے تعجب دلانے ناظرین کے یا رُلانے سامعین کے نظم کیا کرتے ہیں بلکہ اختراع و افترا کو مذاقِ شاعری ٹھہراتے ہیں کہ انھیں خرافات کی دستاویز سے..... تشکیک نظر عوام میں ڈالتے ہیں۔''

اس اقتباس میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ نعت گوئی بھی ایسا موضوع نظم نہیں کرسکتی جو قرآن اور روایات متواترہ کے خلاف ہو اور شاعر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ حیرت و استعجاب پیدا کرنے کے لیے یا رونے رُلانے کے لیے اختراع و افترا کرے بلکہ اُسے صرف قرآن اور سیرت کی روشنی میں اپنے جذبات و احساسات کو نظم کرنا پڑے گا۔

علامہ تاج الفحول'' کی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت نعت و منقبت میں استعمال ہونے والے محاورات، تذکیر و تانیث، فصاحت و بلاغت کو بھی نظرانداز نہیں کرتی۔ اس لیے کہ کسی شعر میں موضوع کی اہمیت کے ساتھ اندازِ بیان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''سویم یہ کہ بہ نسبتِ حکم فصاحت و بلاغت نظم و نثر کے عرب شریف میں جو اصل منشا اس فن کا تھا اور خیال تھا اور بالفعل اہلِ ہند کا اور خیال ہے یعنی جیسے قبل نزولِ قرآن شریف کے عرب شریف کے محاورات میں باوجود کثرت اجناس قبائل و اصناف کے اختلاف امثال تذکیر و تانیث و انصراف و عدم انصراف کے ایک محاورہ والا دوسرے محاورہ والے کے محاورہ پر بہ اعتبار عقل و انصاف کے نہ

ہنتا تھا۔ نہ عیب جہالت یا عدم فصاحت کا لگاتا تھا اسی طرح بعد نزول قرآن شریف کے بھی جو افصح الکلام ہے باوجودیکہ لغت و محاورہ قریش پر وہ نازل ہوا اور اسی لغتِ قریش کو بڑا فضل حاصل ہوا۔

دوسرے محاورات پر باعتبار انصاف شرع کے بھی ہنسنا یا خلاف فصاحت کہنا یا ان کو ترک کر دینا لازم نہ ہوا مگر ہندوستان میں دیگر بلاد کا تو کیا ذکر ہے، دہلی لکھنؤ جو بالفعل پایۂ تخت فصاحت و بلاغت شمار کئے جاتے ہیں ان میں جس طرح باعتبار تانیث و تذکیر کے بیہودہ و بیکار جنگ و پیکار رہے وہ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ہے۔ پھر قطع نظر اس اختلاف سے خاص دہلی کے شاعروں میں مثلاً مومنؔ اور غالبؔ اور ذوقؔ وغیرہم میں جو کچھ گزرا اب ان کے مقلدین میں جو کچھ گزرتا ہے، قابلِ تماشا ہے۔ ہر چند یہ فقیر ایسے خرافات کی طرف التفات کرنا عفو جانتا ہے مگر عرض یہ کہ طالب علموں کے کلام پر جو مطابق محاورات خاصہ کے بغیر تصنع و تحدیق کے بطور مناجات نظم میں لائیں حضرات شعرائے روزگار کو مناسب ہے کہ انگشت اعتراض و تمسخر نہ اٹھائیں۔

چہارم یہ کہ بعض طالب علم جو اپنے تئیں فنون عربیت دانی اور منتخب عصر جانتے ہیں اور شاید کہ سوائے نحو میر اور منتخب اللغات دیکھنے کی استعداد کے کچھ لیاقت نہیں رکھتے ہیں۔ ہر ایک موقع پر باعتبار لغات یا صفات یا محاورات کے ادعائے عدم جواز وصحت لازم گردانتے ہیں اور علماء کے کلام پر اپنی کمالِ حیا سے اعتراض کو موجود ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اعتراضات بعد تفتیش و تحقیق کتب مبسوط لغت و نحو کے باطل محض ہوتے ہیں۔ پس اولاً تفتیش کر لینا

لغات و محاورات عرب کا کتب مبسوط سے ضروری کار ہے پھر ادعا
کرنے کا اختیار ہے۔''

یہ نسبتاً طویل اقتباس نعتیہ اور منقبتیہ منظومات کے لیے جو اصول و ضوابط پیش کرتا ہے اس سے محتاط شرعی رویہ کا اظہار ہوتا ہے جو علامہ تاج الفحولؒ کے مزاج کا خاصہ تھا۔ دوسری طرف یہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ علامہ کی نگاہیں نفس موضوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان، صرف و نحو اور الفاظ و لغات پر کتنی باریک تھیں اور وہ نعتیہ شاعری کے ڈھانچے کو شرعی اور شعری دونوں نقطۂ نگاہ سے کتنا معتبر اور باوقار بنانا چاہتے تھے۔ علامہ کے اس مقدمہ کو جو انھوں نے 'بہارستانِ منقبت' پر تحریر کیا۔ اگر نعتیہ شاعری کا منشور اعظم اور معیارِ کامل کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کے لیے جس استعداد، صلاحیت اور احتیاط کی ضرورت ہے وہ علامہ تاج الفحولؒ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے اس میں کئی پشتوں سے علم و ارشاد کا سلسلہ جاری تھا اور جس میں اسلاف کرام کے اعمالِ صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا چلا آیا تھا۔ علم حدیث و سنت کی خدمت میں، چاکری کی سعادت ابتدا ہی سے اس خاندان کے حصہ میں آئی تھی۔ ان کے جدامجد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے لے کر خود علامہ تاج الفحولؒ تک زہد و تقویٰ اور علم و عمل کی روایتیں اس خاندان میں موجود تھیں۔ صرف و نحو، معانی و بدائع، اصولِ حدیث، علم کلام، علم قرأت، علم سیرت، علم الرجال، علم لغت، علم الاسرار، علم الجدل ان تمام علوم پر صرف ان کی نگاہ ہی نہیں تھی بلکہ محبِ رسول ان کے نام کا ایک حصہ بھی تھا۔ درویشی اور قلندری کی صفات نے انھیں فقیر تخلص رکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ معاصر علمائے کرام انھیں خصوصیت کی بنا پر ان کی بڑی عزت کرتے تھے انھیں کے حوالہ سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا احمد رضا خاں نے اپنے عربی قصیدہ میں کہا تھا:

''یہ علمائے کرام ایسے ہیں جب کسی ویرانے میں اترتے ہیں تو ان
کے قدم سے ویرانہ پر رونق شہر ہو جاتا ہے اور جب وہ روانہ ہوتے

ہیں تو شہر ویرانہ بن جاتا ہے۔'' (قصیدہ آمال الابرار وآلام الاشرار)

صرف یہی نہیں بلکہ چراغ انس میں فرمایا تھا:

اے امام الہدیٰ محبّ رسول دین کے مقتدا محبّ رسول
تجھ پہ فضلِ رسولؐ کا سایہ مجھ پہ سایہ ترا محبّ رسول
شرم والے غنیؓ کا بیٹا ہے کانِ جود و حیا محبّ رسول

علامہ تاج الفحول اگر ایک طرف عشقِ رسول میں درجۂ غنا پر فائز تھے تو دوسری جانب حضرتِ غوثِ اعظم سے بھی بے انتہا محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہی دونوں منبع ومخزن تھے جہاں سے علامہ کی نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کا سرچشمہ پھوٹتا تھا اور اس کی جانب انھوں نے اپنے اشعار میں اشارے بھی کئے تھے:

گرچہ اعمال فقیر اپنے برے ہیں لیکن
شکر ہے سگ اسی دربار کے کہلاتے ہیں

مست رہتے ہیں مئے حبِّ نبی سے ہر دم
جن کو ملتی ہے ترے عشق کی لذت یا غوث

عشقِ رسول، حبِّ صحابہ اور محبتِ اہلِ بیت کے علاوہ غوثِ اعظم کی الفت وعقیدت یہی وہ محور ہیں جن کے گرد علامہ کی طاہر اور پاکیزہ نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کا شعلۂ معنوی رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مطالعہ کریں تو آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ علامہ تاج الفحول انھیں چراغوں کے پروانے ہیں جن سے بزم کائنات روشن اور مستنیر ہے:

تیری رفعت کو لکھے کیا یہ فقیرِ خستہ
شان میں تیری رفعنا لک ذکرک آیا
ان کے ہفت اندام پر قرباں ہیں یہ ساتوں زحل
مہ، عطارد، مشتری، مریخ، زہرہ، آفتاب

نعمتِ حق کے خزانے پہ غریب آپہنچے
یعنی ہم آج مدینے کے قریب آپہنچے (مدحِ نبی)

ابوبکرؓ تھے رازدارِ محمدؐ ابوبکرؓ تھے غمگسار محمدؐ
بہم تھے وہ دنیا میں یوں جیسے اب ہے مزار ان کا نزدِ مزارِ محمدؐ

دیکھ لو قرآن اور توریت و انجیل و زبور
سب ظاہر ہے ثنائے مصطفےٰ و چار یار
بالیقیں محبوب ہے اللہ کا وہ نیک بخت
جس کو ہے عشق و ولائے مصطفےٰ و چار یار (مدح صحابہ)

لکھتا ہے کلک مدح جنابِ حسینؓ کی یعنی نبی کے لختِ جگر نور عین کی
تشبیہ دینا ماہ سے ناقص ہے لاکلام نورِ نگاہ صاحبِ بدر و حنین کی
خوشبو مہکتی میرے جو طرزِ سخن سے ہے مدح جناب پاک امام حسنؓ سے ہے
ہے تجربہ کہ ہوتی ہیں حل ساری مشکلیں جس دم حسنؓ کا نام نکلتا دہن سے ہے
(مدح اہلِ بیت)

مست رہتے ہیں مئے حبّ نبی سے ہر دم
جن کو ملتی ہے ترے عشق کی لذت یا غوث
ہو فقیر خستہ پہ شاہا کرم از برائے غوث اعظم الغیاث
(مدح غوثِ اعظم)

ان اشعار سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوجاتی ہے کہ علامہ تاج الفحولؒ کی نعتیہ اور منقبتیہ شاعری کے محرکات کیا ہیں اور وہ کون سے مینارۂ نور ہیں جن کی روشنی پا کر ان کا کلام روشن اور تابناک ہوا ہے۔

اچھے نعتیہ کلام کے حسن میں اس وقت اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ جب شاعر احترام و ادب کے سارے لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھے اور اسی سیاق وسباق میں الفاظ ومحاورات،

صنائع و بدائع اور ضمائر کا استعمال کرے چونکہ اردو زبان میں کلماتِ تعظیمی بہت زیادہ مستعمل ہیں اس لیے نعتیہ کلام میں ضمائر 'تو' اور 'تم' قابلِ اجتناب ہو جاتے ہیں۔ جو شعرا شریعت کے رموز و نکات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ ان کی جگہ 'وہ' 'ان' اور 'آپ' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ علامہ تاج الفحولؒ کا کلام چاہے وہ فارسی کا ہو یا اردو کا، اگر ایک طرف احترام کے تمام تر واجبات کو پورا کرتا ہے تو دوسری جانب الفاظ و محاورات، ضمائر اور صنائع و بدائع کا استعمال اس طرح سے کرتا ہے کہ اردو شاعری کے مطالبات بھی پورے ہو جائیں اور جو ممدوح کا شرعی احترام ہے وہ بھی نظر انداز نہ ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ معقولات اور منقولات دونوں پر ان کی نگاہیں گہری ہیں اور وہ الوہیت، نبوت، صحابہ، اہلِ بیت اور اولیائے کرام کے مدارج کے درمیان جو حدِ فاصل ہے اس سے خاطر خواہ، قرآن اور حدیث کی روشنی میں واقف ہیں۔ عموماً شعراء حب نبی تو رکھتے ہیں مگر چونکہ ان کی دینی معلومات کم ہوتی ہے اس لیے جذبات عقیدت کے تموج اور مد و جزر میں ان سارے حدود کو پار کر جاتے ہیں جن کی پابندیاں قرآن حکیم نے ہم پر لازم رکھی ہیں مگر علامہ تاج الفحولؒ کا کلام شرعی احتیاط کے ساتھ احترام کے واجبات کو پورا کرتا ہے۔ مثلاً:

بقول نبی خلد میں بھی رہیں گے مشرف بقرب و جوارِ محمدؐ

نبی کریمؐ کے انصار کے بارے میں فرماتے ہیں:

مومنو دیکھو کلام اللہ میں مداح ہے

حق تعالیٰ جابجا اس زمرۂ اخیار کا

(قرآن کی روشنی میں)

وہ محبوب خدا جن کی کہ ذاتِ پاک کا بیشک

خدائے اقدس و اعلیٰ بذات خود ثنا خواں ہے

آیا جہاں میں اس شہِ دیں کے طفیل سے
جو کچھ سمک سے لے کے عیاں تا سماک ہے

(قرآن و حدیث کی روشنی میں)

آپ ان کا کلام شروع سے آخر تک پڑھ ڈالئے آپ ہر جگہ یہ محسوس کریں گے کہ انھوں نے اپنے مدوحین کی مدح شرعی احتیاط کے ساتھ کی ہے اور ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں شریعت کی تخفیف ہوئی ہو۔ یہ احتیاط انھوں نے تشبیہ و استعارات کے ضمن میں بھی کی ہے۔ وہ تشابیہہ و استعارات جن سے عموماً مجازی فضا تیار کی جاتی ہے ان کو جا بجا رڈ کیا ہے اور رد کرتے ہوئے بھی مدوح کی تعریف کر ڈالی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

ناقص ہے یہ تشبیہ لکھوں گر مہِ کامل
شق اس کو فقط ایک اشارے میں کیا ہے

مشکِ ختن سے عود سے تشبیہ ہے خطا
ریحان روحِ پاک شہِ مشرقین کی
تشبیہ دینا ماہ سے ناقص ہے لاکلام
نورِ نگاہ صاحب بدر و حنین کی

غیر مطبوعہ اور مطبوعہ کلام میں جا بجا مجازی تشبیہات و استعارات کے رد کرنے کا عمل جاری ہے اور اسی لیے بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ خالص نعت اور منقبت کی جلوہ گری علامہ تاج الفحولؒ کے کلام میں ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غزوات کی ابتدا پر عرب کے ”جاہلی شعراء“ کی تیغ زبان بھی اسلام کے مقابلہ کے لیے بے نیام ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر نبی کریمؐ ان صحابہ کو جو شعر و شاعری میں بھی دخل رکھتے ہیں جوابات دینے پر مامور فرماتے تھے۔ بقول مصنف شرحِ زرقانی سیرت نگاروں نے ایسے شعرا کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''یعنی آپ کے شعراء جو اسلام کی مدافعت کرتے تھے اور اس کی
حمایت کرتے تھے نہ کہ وہ جنھوں نے صحابہ اور صحابیات میں سے
آپ کی مدح کے اشعار کہے۔''

ان شعرا نے اپنی فصاحت و بلاغت کی تیغ آبدار سے اسلام کی مدافعت کی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ان شعراء کا کلام سن کر غیر مومن قبیلے کے شاعر نے اعتراف عجز کیا۔ پورا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ حضرت تاج الفحولؒ نے اپنے کلام میں اس روایت کا بھی احترام کیا ہے اور ان لوگوں کو ملامت کا نشانہ بنایا ہے جو ان کے نزدیک راہِ حق سے ہٹ گئے ہیں اور مسلمانوں کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں۔ مثلاً:

جو اصحابِؓ رسول اللہ کا بدگو ہے دنیا میں
نہیں ممکن کہ پاوے حشر میں لذت وہ کوثر کی

حسد سے منکرِ تعظیم آنحضرت سے جلتے ہیں
ادب سے ذکر مولد پر جو ہوتا ہے کھڑا مداح

جل جاتے ہیں بے دین جو سن پاتے ہیں کچھ بھی
کس دھوم کا ہوتا ہے واں چرچا شبِ معراج

ہیں منافق جو ہیں تعظیمِ مدینہ سے پھرے
کذب ہے، ان کو جو دعوائے مسلمانی ہے

بد کہتے ہیں تعظیم کو ان کی وہی بدبخت
رکھتے ہیں دلوں میں جو پیمبر سے وہ کینہ

بھاگتا ہے ذکر سے حضرت کے شیطاں دور دور
رغم شیطانِ لعیں ہے بزمِ میلاد نبی

جہنم میں دشمن ہیں قید آپ کے
بہشت ایک ادنیٰ ہے گھر آپ کا

جو منکر ہے نبی کے چار یارانِ مکرم کا
خدا کا چور ہے اور بندۂ شیطان رہزن ہے

جو بزمِ ذکر مصطفوی کو برا کہے
دشمن رسول پاک کا وہ روسیاہ ہے

نعتیہ کلام میں اس طرح کے اشعار میں بھی نہ صرف نعت کی روایت میں شامل ہیں بلکہ اردو شعرانے بھی اگر ایک طرف اپنے دینی اور دنیوی ممدوحین کی تعریف کی ہے اور ان کے فضائل ومناقب بیان کئے ہیں تو دوسری جانب انھوں نے مخالفین کو بھی طعن و طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس طرح کے اشعار اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ علامہ تاج الفحولؒ نہ صرف اپنے عقائد حب رسول میں ایمان وایقان رکھتے تھے بلکہ جولوگ اس میں ذرا بھی تامل یا کمی کرتے تھے ان کو بھی طعن وطنز کا نشانہ بناتے تھے۔ منشا یہ ہوتا تھا کہ خوفِ خدا کا احساس دلا کر ان کو راہِ راست پر لایا جائے۔

نبی کریمؐ پر درود وسلام اور ان کا ذکرِ جمیل خواہ قولی ہو یا فعلی۔ ایک طرح کی عبادت ہے۔ یہ عبادت عشق کی تیغِ جگر دار اور علم وآگہی کی نیام دونوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ مکتب کی کرامت اور فیضانِ نظر دونوں کے حوالوں سے معتبر ہوتی ہے۔ علامہ تاج الفحولؒ ہمارے ان اکابر میں سے تھے جنھیں دونوں شرف حاصل تھے۔ انھوں نے دلِ گداختہ بھی پایا تھا اور مومن کی نگاہ بھی۔ ان کا سینہ عشقِ نبی کا گنجینہ اور ان کے احساسات نورانی

اور پاکیزہ تھے۔ انھیں یہ بھی قدرت حاصل تھی کہ وہ اپنے پاکیزہ اور طاہر جذبات کو دلکش اور موثر انداز میں اشعار کے پیکر میں ڈھال سکیں، ان کا نظامِ فکر و وجدان قرآنی تعلیمات، اسلامی عقائد و شعائر اور بزرگوں کی محبت میں پروان چڑھا تھا۔ اسی لیے ان کی نعتوں اور منقبتوں میں اگر ایک طرف ان کا قلم مہک مہک کر چلتا ہے تو دوسری طرف وارفتگی اور شیفتگی کا سارا حسن ان کے اشعار میں درود و سلام پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ شعر و ادب کی پذیرائی تو ادیب، شاعر، ناقد اور دانشور کرتے ہیں مگر نعتیہ جذبات و احساسات کا صلہ تو وہاں ملتا ہے جہاں خدا خود میر مجلس ہو اور شمعِ محمدی کی ضیاباریوں پر پروانے نثار ہو رہے ہوں۔ اس بارگاہِ نعت میں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر تاج الفحول المتخلص بہ فقیرؔ بھی داخل ہوئے مگر عرفیؔ شیرازی کے الفاظ میں اس احساس کے ساتھ:

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبیست

○■○